ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دُودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ـــــــــ ستمبر ۱۹۹۷ء

ـــ ایڈیٹر :ـــ

سیّد جلال الدّین عمری

پانی والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۶ شمارہ ۳

جولائی ـــــــــ ستمبر ۱۹۹۷ء

ربیع الاول ـــــــــ جمادی الاول ۱۴۱۸ھ

زرتعاون

اندرون ملک	ـــــــــ	فی شمارہ	۲۰ روپے
ـــــــــ	ـــــــــ	سالانہ	۷۵ روپے
ـــــــــ	لائبریری وادارے	سالانہ	۱۰۰ روپے
بیرون ملک	ـــــــــ (انفرادی)	"	۳۵۰ روپے
ـــــــــ	ـــــــــ (ادارے)	"	۵۰۰ روپے
پاکستان	ـــــــــ (انفرادی)	"	۱۵۰ روپے
ـــــــــ	ـــــــــ (ادارے)	"	۲۰۰ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے نازیہ پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپواکر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

سفرِ حج — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق و تنقید

تفسیرِ نسفی ۔ ایک تحقیقی مطالعہ (۲) — پروفیسر کبیر احمد جائسی — ۴۱

احادیثِ فضائل ۔ ایک تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمد سلیم — ۶۲

سیر و سوانح

خرم جاہ مراد — ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی — ۸۶

سیاسیاتِ عالم

اسلام کے سیاسی فکر کی تشکیلِ جدید — ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی — ۹۴

(مولانا سید سلیمان ندوی اور معاصرین کے افکار کا مطالعہ)

تعارف و تبصرہ

احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذائیں — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۰

حلال و حرام — " " — ۱۱۴

ماہنامہ افکارِ ملی کا خصوصی شمارہ — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۶

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی — (ادارہ) — ۱۱۸

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی
سابق ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر محمد سلیم
استاد شعبۂ دینیات - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی
ریڈر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
استاد شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۶۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۷۔ سید جلال الدین عمری
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

خوش نویس
ابن سیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

سفرِ حج

سید جلال الدین عمری

اللہ تعالیٰ نے چار سال قبل ۱۹۹۴ء میں حج کی سعادت سے نوازا تھا۔ اس کے بعد ہی سے میری اہلیہ بھی اس خواہش اور تمنا کا اظہار کرنے لگیں کہ وہ بھی اس سعادت سے بہرہ ور ہونا چاہتی ہیں۔ ادھر ان پر حج فرض بھی ہو گیا تو ان کا اصرار بڑھنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سال ۱۹۹۷ء / ۱۴۱۷ھ میں اس کی صورت پیدا فرمائی۔

حج کی فرضیت اور فضیلت

حج کی سعادت بہت بڑی سعادت ہے ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک جامع عبادت ہے، اس میں نماز ہے، ذکر و فکر ہے، تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل ہے۔ طواف اور سعی ہے، خدا کی راہ میں تگ و دو اور قربانی ہے۔ اس میں جسمانی محنت و مشقت کے ساتھ انفاقِ مال بھی ہے۔ یہ مجموعہ ہے بہت سی عبادات کا۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا: جہادکن الحج (تم عورتوں کا جہاد حج ہے) ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: نعم الجہاد الحج (تمہارے لیے بہترین جہاد حج ہے) (بخاری، کتاب الجہاد، باب جہاد النساء)

ایک مسلمان جو عاقل و بالغ ہے۔ آزاد ہے، تندرست ہے۔ زادِ راحلہ اور مصارفِ سفر برداشت کر سکتا ہے۔ عورت کے ساتھ محرم بھی ہے تو حج فرض ہو جاتا ہے۔ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (آل عمران: ۹۷)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔

حج میں جن حدود و آداب کا خیال رکھنا چاہیے انھیں قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ	حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص
فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ	ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے
فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا	خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس
جِدَالَ فِي الْحَجِّ، وَمَا	سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی
تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ	لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو
اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ	نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں
الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ	ہوگا۔ سفر حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لیتے
يَا اُولِي الْاَلْبَابِ	جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری
(البقرہ - ۱۹۷)	ہے۔ پس اے ہوش مندو میری نافرمانی سے بچو۔

حج کی فضیلت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنیے۔ ایک مومن کا دل آخرت کی کامیابی کے تصور سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جنت اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ آپؐ نے حج مبرور کی جزا جنت قرار دی ہے۔ حج مبرور وہ حج ہے جس میں پورے اخلاص کے ساتھ اس کے احکام انجام دیے جائیں وہ خدا کے ہاں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

العمرة الى العمرة كفارة لما بينهما	ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کی
والحج المبرور ليس له جزاء الا	کوتاہیوں کے لیے کفارہ بن
الجنة (بخاری کتاب العمرۃ، باب وجوب	جاتا ہے اور حج مبرور کی جزا بس
العمرة وفضلها مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرۃ)	جنت ہے۔

ایک اور روایت سنئے:

من حج هذا البيت	جس نے اس گھر کا حج کیا۔ جنسی تعلق
فلم يرفث ولم يفسق رجع كما	اور گندی باتوں سے بچا رہا فسق و
ولدته امه۔	فجور سے اجتناب کیا تو اس طرح
(بخاری کتاب المحصر، باب قول اللہ تعالیٰ فلا	گناہوں سے پاک و صاف ہو کر لوٹے گا

رفث۔ مسلم کتاب الحج باب فضل الحج والعمرۃ) جیسے اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔

حج کا تعلق حضرت ابراہیم سے

حج کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات مقدسہ کے بعض اہم واقعات سے ہے۔ حضرت ابراہیم کا اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے امتحان لیا اور وہ سخت آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ جب وہ ان سب سے کامیاب گزر گئے تو دنیا کی امامت انھیں عطا کی گئی۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ

(البقرہ: ۱۲۴)

یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں ابراہیم نے عرض کیا اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے اس نے جواب دیا "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے"

اسی طرح کے ایک امتحان سے گزار کر حضرت ابراہیم کے ہاتھوں خانۂ کعبہ کی تعمیر ہوئی۔ وہ اہل ایمان کی عبادات کا مرکز بنا اور اس کے حج و زیارت کا حکم دیا گیا۔ حج کی تاریخ حضرت ابراہیم کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ اس تاریخ کا ہر ورق اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی بندگی اور اطاعت اور تسلیم و رضا کے قلم سے لکھا گیا ہے۔

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کا مکہ میں آباد ہونا

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ مکہ کی سرزمین توحید کا مرکز بنے، وہاں اس کا گھر تعمیر ہو اور وہ اس کے ماننے والوں کا قبلہ و کعبہ قرار پائے۔ مکہ سلسلۂ کوہ سے گھرا ہوا بے آب و گیاہ قطعۂ زمین تھا۔ یہ ایک وادی غیر ذی ذرع تھی جہاں کسی ذی روح کی زندگی کا کوئی سامان نہ تھا، جہاں انسان کیا، جانوروں اور پرندوں کا بھی شاید گزر نہ ہوتا تھا۔ اسے آباد کرنے کے لیے باہر سے کسی قوم اور قبیلہ کو لاکر بسایا نہیں گیا بلکہ حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنی اکلوتی اولاد (حضرت اسماعیل) کو جو ابھی ماں کی گود میں پرورش پا رہے

تھے، جنھوں نے شیر خوارگی کا مرحلہ ابھی طے نہیں کیا تھا۔ یہاں چھوڑ آئیں۔ اس حکم کی تعمیل کتنی دشوار رہی ہوگی۔ لیکن معاملہ حضرت ابراہیم کا تھا وہاں ہر محبت پر خدا کی محبت غالب آچکی تھی۔

حضرت ابراہیم ایک لمبا سفر طے کر کے شام سے اس وادی غیر ذی زرع میں پہنچے اور ایک سایہ دار جنگلی پیڑ کے نیچے جہتی بیوی اور معصوم بچے کو پہنچا دیا۔ کچھ کھجوریں اور پانی کی ایک چھاگل بیوی کے حوالے کی اور شام کی طرف واپس ہونے لگے۔ بیوی نے پوچھا کہ اس لق و دق بے آب و گیاہ میدان میں اور ان پہاڑوں کے درمیان کہاں چھوڑے جا رہے ہیں؟ یہاں کوئی انسان نظر آرہا ہے اور نہ کھانے پینے اور رہائش کا کوئی نظم ہے۔ حضرت ابراہیم پر سکوت طاری رہا۔ شاید فرطِ جذبات سے زبان آمادۂ سخن نہ رہی ہو۔ بیوی نے پھر پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے؟ جواب ملا: ہاں۔ اس پر اس اللہ کی بندی نے جو حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور حضرت اسماعیلؑ کی ماں تھی سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا اللہ تعالیٰ کے فرمان پر آپ نے قدم اٹھایا ہے تو وہ ہماری حفاظت فرمائے گا اور ہمیں ہلاک نہ ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع انھیں ہلاک ہونے نہ دیا اور ایسی حیاتِ دوام بخشی جس پر ہزاروں لاکھوں زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ واپس ہوتے ہوئے کچھ دور نکل آئے۔ بیوی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ننھی اور معصوم اولاد نامعلوم ماں کی گود میں ناز و ادا دکھا رہی تھی یا فرشِ زمین کو اپنے وجود سے رونق بخش رہی تھی۔ قریب کی ایک پہاڑی سے پلٹ کر دیکھا۔ جذبات ابل پڑے۔ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا اور اللہ کا بندہ اللہ ہی سے عرض کرتا ہے:

رَبَّنَا اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ	وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو
بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا	تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔
الصَّلٰوةَ، فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً	پروردگار! یہ میں نے اس لیے کیا ہے
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ	کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور
لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ۔	انھیں کھانے کو پھل دے۔ شاید کہ یہ
(ابراہیم: ۳۷)	شکر گزار بنیں۔

یہ دعا ہو سکتا ہے اس وقت بھی کی ہو اور خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد بھی کی ہو۔ حضرت ابراہیم کا یہ اقدام خدا کے حکم اور فیصلے کے تحت ہوا تھا۔ کسی دوسرے فرد بشر کو اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو اس طرح بے یار و مددگار کسی جنگل و بیابان کی نذر کر دے اور موت کے منہ میں انھیں دھکیل دے۔ ورنہ وہ ان کی ہلاکت کا ذمہ دار اور سزا کا مستحق قرار پائے گا۔

حضرت ابراہیمؑ بیوی اور بچے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے روانہ ہو گئے۔ حضرت ہاجرہ کو بھوک لگتی تو چند کھجوریں کھا لیتیں اور جو پانی تھا اس سے پیاس بجھا لیتیں اور حضرت اسماعیل بھوک پیاس سے رونے لگتے تو انھیں اپنا دودھ پلا دیتیں اور انھیں زندہ رکھنے کی کوشش کرتیں۔ ہاجرہ کی غذا کا توشہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ دودھ بھی خشک ہونے لگا۔ حضرت اسماعیلؑ بھوک سے بے تاب ہونے لگے۔ ماں سے یہ کیفیت دیکھی نہیں جا رہی تھی، تڑپ اٹھیں قریب میں صفا کی پہاڑی تھی اوپر چڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑانے لگیں کہ شاید کوئی آدم زاد نظر آئے یا پانی کا کوئی سراغ لگے۔ وہاں کوئی چیز نہ تھی مایوس ہو کر اتر آئیں۔ کچھ فاصلے پر مروہ کی پہاڑی تھی اس پر پہنچ گئیں۔ لیکن وہاں بھی مایوسی ہی ہاتھ آئی۔ اس طرح سات مرتبہ ان پہاڑیوں کے درمیان چکر کاٹتی رہیں اور درمیان میں بچے کو دیکھنے کے لیے بھی پہنچ جاتیں جو بظاہر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

حضرت ہاجرہ کا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ تکلیف برداشت کرنا اور اس کے لیے یہ تڑپنا اور یہ دوڑنا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ وہ اس کی راہ میں تگ و دو کی علامت بن گیا اور حج کا جزو قرار پایا۔ ایک خاتون کا عمل ہر مرد اور ہر عورت کے لیے اسوہ بن گیا۔

حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان جب سات چکر لگا چکیں تو انھوں نے ایک آواز سنی۔ انھیں اپنے کانوں پر شبہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پھر یہی آواز سنی۔ یہ دراصل فرشتے کی آواز تھی۔ اس نے سطح زمین کو کریدا تو پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ حضرت ہاجرہ گھبرا گئیں۔ فرشتے نے انھیں اطمینان دلایا۔ گھبراؤ نہیں اللہ تمہاری حفاظت کرے گا اور یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے باپ کے ساتھ یہاں اللہ کا گھر تعمیر کرے گا۔ حضرت ہاجرہ نے پانی کو ابلتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے اپنا مشکیزہ بھر لیا اور اس کے چاروں طرف حوض بنا کر

اسے روکنے کی کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اگر ہاجرہ اس پانی کو نہ روکتیں تو وہ ایک چشمۂ جاری ہوتا اور دریا کی طرح ہمیشہ رواں دواں رہتا۔

وادی میں پانی جب نکل آیا تو آبادی کی صورت بھی پیدا ہوگئی۔ قبیلۂ جرہم کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ اس کے کچھ لوگ سفر کرتے ہوئے کداء کے راستے سے مکہ کے نشیبی علاقے میں خیمہ زن ہوئے۔ انھوں نے ایک پرندے کو منڈلاتے دیکھا تو کہا کہ ہماری معلومات کی حد تک یہاں پانی نہیں ہے پھر یہ کیوں منڈلا رہا ہے؟ یہ پرندہ تو وہاں پایا جاتا ہے جہاں پانی ہوتا ہے۔ انھوں نے دو ایک آدمیوں کو تحقیق حال کے لیے بھیجا تو خبر ملی کہ وادی میں پانی موجود ہے۔ قافلے کے لوگ وہاں پہنچے تو حضرت ہاجرہ چشمے کے پاس موجود تھیں۔ انھوں نے وہاں قیام کی اجازت چاہی تو حضرت ہاجرہ نے کہا۔ ہاں تم قیام کر سکتے ہو لیکن پانی پر تمہارا حق نہ ہوگا۔ اسے انھوں نے تسلیم کر لیا۔ جلد ہی قبیلۂ جرہم کے اور لوگ وہاں آباد ہو گئے ان سب کے درمیان ایک طرح کا انس اور محبت پیدا ہوگئی۔ حضرت اسماعیلؑ نے انھیں کے درمیان پرورش پائی۔ عربی زبان بولنے لگے اور ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہوئی۔ (بخاری، کتاب الانبیاء)

قربانی

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل اس وادی غیر ذی زرع کو آباد کر رہے تھے۔ حضرت ابراہیم ان کے پاس آتے جاتے اور ان کی خبر گیری کرتے رہے۔ حضرت اسماعیل اب چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کے قابل ہو گئے تو حضرت ابراہیم کو ایک اور امتحان سے گزارا گیا۔ یہ امتحان شاید سابقہ امتحانات سے زیادہ شدید تھا۔ حضرت ابراہیم کو خواب میں اشارہ ہوا کہ اپنی اکلوتی اولاد کو خدا کی راہ میں ذبح کر دیں۔ باپ نے بیٹے سے اس کا ذکر کیا۔ اس کا بیان قرآن کے الفاظ میں سنئے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ	وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ
يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي	کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو ایک روز ابراہیم
أَذْبَحُكَ، فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ	نے اس سے کہا بیٹا میں خواب میں
(صافات: ۱۰۲)	دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟

بیٹے نے بے ساختہ جواب دیا: اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ	اس نے کہا ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا
سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ	جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ انشاءاللہ
الصَّابِرِينَ (الصافات: ۱۰۲)	مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

اسی جواب کی حضرت اسماعیل سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کم سنی میں بیٹے کی سعادت اور خدا ترسی پر حضرت ابراہیم کا دل شکر و امتنان سے لبریز ہو گیا ہو گا۔ اس کے لیے پیار و محبت کے جذبات امنڈ آئے ہوں گے۔ کیا معلوم کہ آنکھوں میں خوشی کے موتی تیرنے لگے ہوں حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ (الصافات: ۱۰۰) اے اللہ مجھے صالح اولاد عطا فرما۔

حضرت اسماعیل نے عہدِ طفلی ہی میں ثابت کر دکھایا کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی۔ وہ صالح فطرت لے کر آئے ہیں اور خدا کے ہر حکم کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار ہیں۔

معصوم بچے کی زبان سے صبر و ثبات کے یہ الفاظ سننے کے بعد خدا پرست باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چشمِ فلک حیران تھی کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے؟ زمین کانپ رہی تھی کہ اس پر کیا پیش آنے والا ہے؟ فرشتے انسان کی عظمت کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ مخلوقِ خدا دیکھ رہی تھی مٹی کا بنا ہوا انسان خدا پرستی کا کتنا اونچا اور کتنا بلند و بالا مینار تعمیر کر سکتا ہے۔

باپ اور بیٹے کے اس والہانہ اقدام اور ان کے جذبۂ سرفروشی کے بیان کے لیے الفاظ آپ کو خدا کی کتاب سے لینے ہوں گے۔ ارشاد ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ	جب وہ دونوں مطیع فرمان ہو گئے اور
(الصافات: ۱۰۳)	ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔

یہ سراپا اسلام تھا۔ اس میں مطیع فرمان ہونے اور تعمیلِ حکم کا تصور ہے۔ اس میں خود سپردگی اور حوالگی کا بھی مفہوم ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے باپ بیٹے سراپا اسلام بن گئے ہوں۔ کیا اسلام کی اس سے بہتر اور کوئی تفسیر ہو سکتی ہے؟

حضرت ابراہیم نے بیٹے کو چت نہیں لٹایا بلکہ چہرے کے بل لٹایا تاکہ ذبح کے وقت بیٹے کے چہرے پر نظر پڑنے سے جذباتِ پدری غالب نہ آ جائیں، جو قدم بڑھ چکا ہے وہ پیچھے نہ ہٹ جائے اور اس میں لغزش نہ آ جائے۔ یہ اسلامِ کامل کے منافی تھا۔

ابھی حضرت ابراہیمؑ کی چھری حضرت اسماعیلؑ کے حلقوم پر نہیں چلی تھی کہ پردۂ غیب سے آواز ابھری:

یَا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا — اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔
کَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صافات: ۱۰۵) — ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

باپ کے ہاتھوں بیٹے کو ذبح کرانا مقصود نہ تھا۔ یہ تو محض خدا سے تعلق کا امتحان تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ثابت کر دیا کہ خدا کی محبت اولاد کی محبت پر غالب ہے اور اس محبت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ وہ اس محبت میں بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں۔ حکم ہوا کہ اس امتحان میں تم کامیاب ہو گئے۔ اسی جذبے کے ساتھ ایک بکرا ذبح کر دو۔

وَفَدَیْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ — اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے
(الصافات: ۱۰۷) — کر اس بچے کو چھڑا لیا۔

انسانی غذا میں جانوروں کا گوشت ہمیشہ شامل رہا ہے اور اس کے لیے جانور ذبح ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اس جذبے نے اسے ایک پاکیزہ رخ دے دیا ہے۔ اس طرح جانور کا ذبح کرنا محض غذائی ضرورت کی تکمیل نہیں بلکہ خدا کی راہ میں ہر چیز قربان کر دینے کی علامت بن گیا۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ یہ بکرا جنت سے آیا تھا اور بعض نے کہا کہ یہ کوہ ثبیر سے اترا اور حضرت ابراہیم نے اسے بطور فدیہ ذبح کیا (قرطبی۔ احکام القرآن جلد ۱۵ ص: ۱۰۷) اس بحث سے قطع نظر حضرت ابراہیمؑ نے جس پاکیزہ جذبے کے ساتھ جانور کی قربانی کی وہ ایک دائمی سنت بن گئی اور بعض مواقع پر اس پر عمل ضروری قرار پایا اور قربانی میں یہی جذبہ مطلوب ہے ورنہ خدا کو گوشت پوست کی حاجت نہیں۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا — نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون
وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ (الحج: ۳۷) — مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

دیوی دیوتاؤں کے نام پر انسانی جان کے نذرانے پیش ہوتے رہے ہیں۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ اس کی مثالیں آج بھی مل جاتی ہیں۔ یہ نذرانے ذاتی اغراض اور پست مقاصد کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی اعلیٰ نصب العین نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم کے اس واقعہ نے بتا دیا کہ کسی چھوٹے مقصد ہی کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے بھی انسانوں کی قربانی ناجائز ہے۔ یہ احترام آدمیت کے منافی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ

کی اس سنت کا نوع انسانی پر یہ بہت بڑا احسان ہے۔

رمی جمار

حضرت ابراہیم بیٹے کو ذبح کرنے کے ارادے سے نکلے تو تفسیری روایات میں آتا ہے کہ شیطان حضرت اسماعیل کی والدہ کے پاس پہنچا اور کہا کہ تمہیں کچھ پتہ ہے کہ ابراہیم تمہارے لڑکے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم۔ کہا کہ وہ انھیں ذبح کرنے لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا اس حرکت کی ابراہیم جیسے شفیق باپ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ ان کے رب نے انھیں اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت اسماعیل کی ماں نے جواب دیا اگر یہ ان کے رب کا حکم ہے تو انھیں اس پر عمل کرنا ہی چاہیے۔ پھر وہ حضرت اسماعیل کے پاس آیا اور یہی بات دہرائی تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ اللہ کا حکم ہے تو اس پر عمل کیوں نہ ہو۔ میں اس کے لیے آمادہ ہوں۔ آخر میں وہ حضرت ابراہیم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کے خواب میں شیطان آیا تھا اور اس نے آپ کو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس پر آپ عمل نہ کریں۔ حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ شیطان خرقۂ نصیحت پہن کر ان کے پاس آیا ہے انھوں نے اسے دھتکار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ پہلے جمرۂ عقبہ کے پاس آیا تو حضرت ابراہیم نے سات کنکریاں مار کر اسے بھگایا۔ پھر وہ جمرۂ وسطیٰ کے پاس پہنچا وہاں بھی آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں۔ پھر جمرۂ اخریٰ کے پاس پہنچا اور وہاں یہی بات کہی اور حضرت ابراہیم نے سات کنکریاں مار کر اسے بھگا دیا اور پھر اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھے۔ منیٰ میں واقعۂ ذبح پیش آیا۔ یہ سنت بھی ہمیشہ کے لیے جاری ہوگئی اور حج کا ضروری جزء قرار پائی۔

رمی جمار کے سلسلے میں بعض اور توجیہات بھی منقول ہیں (ابن کثیر، تفسیر: ۱۴/۴-۱۵ قرطبی، احکام القرآن: ۱۵/۱۰۵-۱۰۶)

خانۂ کعبہ کی تعمیر

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر فرشتوں نے کی تھی۔ بعض دوسری روایات بتاتی ہیں کہ حضرت آدم کے ہاتھوں اس کی تعمیر ہوئی تھی اور اولادِ آدم کے

لیے یہی مرکزِ عبادت تھا۔ طوفانِ نوح میں یہ زیرِ آب ہوگیا اور اس کے نشانات تک مٹ گئے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اس کی نشان دہی فرمائی اور از سرِ نو اس کی تعمیر ہوئی (قرطبی احکام القرآن: ۲/۱۲۰-۱۲۲)

ان روایات کی صحت مشکوک ہے اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور قرآن مجید نے اس کی گواہی دی ہے کہ اس گھر کی تعمیر حضرت ابراہیم کے ہاتھوں ہوئی جس خلوص اور پاکیزہ جذبے کے تحت ہوئی اس کا ذکر کوئی کیا کرسکے قرآن کے الفاظ میں سنیے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ	اور یاد کرو ابراہیم اور اسماعیل جب
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ	اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ	دعا کرتے جاتے تھے اے ہمارے رب
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، رَبَّنَا	ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب
وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ	کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً	اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع
لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا	فرمان) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی
وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ	قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ	کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے
(البقرہ: ۱۲۷-۱۲۸)	درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور
	رحم فرمانے والا ہے۔

غور کیجیے کسی مادی چیز کی خواہش نہیں کوئی ذاتی غرض نہیں، دولت دنیا کی طلب نہیں۔ آسائش و راحت اور عیش و آرام کی خواہش نہیں۔ شہرت اور ناموری کی آرزو نہیں۔ بلکہ دعا ہے اور خلوص کے ساتھ دعا ہے کہ اے خدا تیرا گھر تعمیر ہو رہا ہے اس خدمت کو قبول فرما، ہم دونوں کو اسلام کی دولت سے نواز دے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق دے۔ ہماری ذریت سے تیری فرمانبردار امت برپا کردے ہمیں تیری عبادت کے طریقے اور مناسک حج سکھا دے۔ ابھی یہ دعا ختم نہیں ہوئی مزید دعا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ	قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انھیں
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور
وَيُزَكِّيهِمْ، إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ	حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں
الْحَكِيمُ (البقرہ: ۱۲۹)	سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

حضرت ابراہیم دیکھ رہے تھے کہ ان کی ذریت پھیلے گی۔ یہ بستی آباد ہوگی اور اسے ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت بھی ہوگی۔ اس کے لیے دعا تھی ایک ایسے پیغمبر اور ایک ایسے رہنما کی جو ان کی ذریت کو خدا کی کتاب سنائے۔ جو اسے فکر و عمل کی گندگیوں سے پاک صاف کرے اور اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور دین کے اسرار و رموز اس پر کھولے — اپنی ذریت اور اپنی اولاد کے لیے اس سے بہتر اور کیا دعا ہو سکتی ہے۔ وہ سینہ کن جذبات سے معمور رہا ہوگا جن سے یہ دعائیں الفاظ کے قالب میں ڈھل رہی ہوں۔ یہ بے غرضی، یہ بے لوثی اور اخلاص و للّٰہیت پیغمبروں ہی کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہی اس معاملہ میں دنیا کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ حرم کو جو عظمت نصیب ہوئی دل کہتا ہے، پورے زور سے کہتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کا خلوص اور للّٰہیت کارفرما رہی ہے۔

حضرت ابراہیم نے جس پیغمبر کی دعا کی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس کا مظہر اتم تھی۔ آپؐ کے ذریعے ان مقاصد کی تکمیل ہوئی جن کی دعا حضرت ابراہیم نے کی تھی اور اس طرح ہوئی کہ اب نوع انسانی کی فلاح و کامرانی کے لیے کسی اور ہدایت، کسی اور رہنمائی کی قیامت تک ضرورت نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ نے وہ مقصد واضح کر دیا تھا جس کے لیے خانۂ کعبہ کی تعمیر کا حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ	یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیم
الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي	کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز
شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ	کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے
وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ	ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے

السُّجُوْدِ — گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ (الحج: ۲۶)

یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (البقرہ: ۱۲۵) — اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

یہ ہدایت تھی اور اعلان تھا کہ یہ گھر توحید کا مرکز ہوگا۔ یہاں صرف خدا کی عبادت ہوگی اسے ظاہری غلاظت اور گندگی سے پاک رکھا جائے گا۔ لوگ اس کا طواف کرنے کے لیے آئیں گے۔ اس میں رکوع و سجدہ ہوگا اور نمازیں پڑھی جائیں گی۔

حجرِ اسود

خانہ کعبہ کا طواف کرنا اور اس کے گرد چکر کاٹنا عین عبادت ہے۔ اس کی بنیادیں جب ایک حد تک بلند ہو چکیں تو حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا کہ کوئی ایسا خوب صورت اور نمایاں پتھر ڈھونڈ لاؤ کہ اسے دیوار میں نصب کر دیا جائے تاکہ وہ طواف کرنے والوں کے لیے علامت کے طور پر استعمال ہو سکے۔ وہ یہاں سے طواف شروع کریں اور یہیں ختم کریں۔ حضرت اسماعیل پتھر ڈھونڈ لائے لیکن حضرت ابراہیم کو پسند نہ آیا۔ وہ دوسرے پتھر کی تلاش میں گئے کہ جبرئیل نے حضرت ابراہیم کو مناسب پتھر کی نشان دہی کی۔ یہی حجرِ اسود ہے اور وہ دیوار میں نصب کر دیا گیا۔ اسے بوسہ دینا سنت اور باعثِ ثواب ہے۔ (قرطبی۔ احکام القرآن ۱۳۲/۲)

مقامِ ابراہیم

حضرت ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ حضرت اسماعیل انھیں پتھر فراہم کرتے تھے۔ جب بنیاد کچھ بلند ہو گئی اور ہاتھ کا وہاں تک پہنچنا مشکل ہو گیا تو حضرت ابراہیم ایک پتھر پر کھڑے ہو کر اسے بلند کرنے لگے۔ اسی کو مقامِ ابراہیم کہا جاتا ہے۔ یہ شاید کچا پتھر

تھا اس پر حضرت ابراہیم کے قدم کے نشانات پڑ گئے۔ لوگوں کے مسلسل ہاتھ لگانے اور چھوتے رہنے کی وجہ سے وہ دھندلے ہوتے چلے گئے۔ ایک وقت آیا کہ وہ نشانات مٹ گئے۔ یہ پتھر خانہ کعبہ کی بنیاد سے لگا ہوا تھا۔ غالباً جہاں تعمیر کا کام ختم ہوا حضرت ابراہیم نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ اس کی وجہ سے طواف میں زحمت ہو رہی ہے تو اسے تھوڑا سا پیچھے ہٹا لیا۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے اس اقدام پر نکیر نہیں کی۔ اس طرح عملاً اس سے اتفاق کر لیا گیا۔

ایک کمزور سی روایت یہ بھی ہے کہ اس پتھر پر حضرت اسماعیل کی اہلیہ نے حضرت ابراہیم کا سر دھلایا تھا۔ اور اس پر حضرت ابراہیم کے کھڑے ہونے کے نشانات تھے۔ اس روایت سے یہاں بحث نہیں ہے۔ قرآن مجید سے حضرت ابراہیم کی طرف اس کی نسبت ثابت ہے اور یہی اس کے احترام کے لیے کافی ہے۔ قرآن نے کہا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ: ۱۲۵)	اور تم مقام ابراہیم کو نماز ادا کرنے کی جگہ بنا لو۔

طواف قدوم کے بعد اس جگہ دو رکعت نماز پڑھنا سنت ہے۔ البتہ اسے چھونا یا اس کا بوسہ لینا ثابت نہیں۔ (قرطبی۔ احکام القرآن ۲/ ۱۱۲-۱۱۳، ابن کثیر، تفسیر ۱/ ۱۶۹-۱۷۱، ابن حجر، فتح الباری ۸/ ۱۶۹)

حج کا اعلان

جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو گئی تو حکم ہوا:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ	اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں، خود بھی کھائیں اور تنگ دست

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج ۲۷-۲۹)	محتاج کو بھی دیں۔ پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

یہ قیامت تک کے لیے اعلان تھا کہ لوگ اس گھر کی زیارت کے لیے آئیں اور ہر طرف سے آئیں۔ اس کا طواف کریں یہاں قربانی دیں اور اپنی نذریں پوری کریں۔ آج تک یہ اعلان باقی ہے اور دنیا کے ہر گوشے سے خدا کے بندے اس گھر کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔

یہ ہے حج کی مختصر تاریخ۔ اس تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ آج بھی بولتی ہے۔ ان مقامات پر پہنچ کر جہاں یہ تاریخ وجود میں آئی اس کی آواز سنی جاسکتی ہے۔ ان مقامات کے مشاہدہ سے آنکھوں کو جلا اور ایمان کو تازگی ملتی ہے۔ یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ آدمی ان اعمال کو بجالانے کی کوشش کرے جو حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ نے انجام دیے تھے۔ اس کا قلب ان کیفیات سے دوچار ہو جو ان مواقع پر طاری ہوتے ہیں یا فطری طور پر طاری ہونے چاہئیں۔ یہی ہے حج کی معنویت۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔	بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس میں خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں۔ مقام ابراہیم (ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ) ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو کوئی گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔ اور جو کوئی

(آل عمران: ۹۶-۹۷) اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے
معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے

سفرِ حج کی روداد سے پہلے حج کا ذکر چھڑ گیا ؎
لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب اس مقدس فرض کی ادائیگی میں ہمارا حال بھی سنیے۔
ہمارا سفر انٹرنیشنل پاسپورٹ کے تحت تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کسی قسم کی دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی۔ ساری کارروائی برادر محترم جناب اعجاز احمد اسلم صاحب اور جناب طارق اکرام اللہ صاحب نے انجام دی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے۔

۲۱ مارچ ۹۷ء کو ہم دونوں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ بچے بھی رخصت کرنے کے لیے ساتھ ہو گئے۔ بڑا لڑکا سید صفی اظہر اسی مقصد سے بمبئی سے آیا ہوا تھا۔ ۲۵ مارچ کی شام کو ۶½ بجے سعودی ایرلائنس سے روانگی تھی رفیقوں اور دوستوں کی دعاؤں کی سوغات لے کر روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر محمد رفعت (داماد) دونوں بچوں اور دونوں بچیوں نے رخصت کیا۔ ایرپورٹ میں جیسے ہی داخل ہوئے اور سفر کے سلسلہ کی معلومات کرنے لگے ایک نوجوان جن کا تعلق بہار سے تھا اور جو سعودیہ میں ملازم تھے، انھوں نے سامان کی چیکنگ سے لے کر بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے تک بلکہ جہاز میں سوار ہونے تک ساتھ دیا۔ وہ خود بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، افسوس کہ میں ان کا نام بھول گیا۔

ہم نے حج تمتع کی نیت کی تھی۔ حج تمتع میں آدمی حج کے مہینوں میں عمرہ کی نیت کرتا ہے، عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد احرام کی پابندیاں اس پر سے ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر حج کے دنوں میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کرتا ہے۔ حج تمتع کرنے والے کے لیے قربانی واجب ہے۔ سفرِ حج شروع ہوتے ہی دہلی ایرپورٹ پر میں نے دو رکعت نفل نماز پڑھی اور عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لیا۔ اہلیہ نے بھی نفل پڑھی اور عمرہ کی نیت کی (عورتوں کے لیے احرام کا مخصوص لباس نہیں ہے وہ اپنے عام کپڑوں میں احرام کی نیت کر سکتی ہیں)

سعودیہ کا طیارہ ظہران ہوتے ہوئے جدہ پہنچا۔ اس وجہ سے سفر میں چھ گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت صرف ہو گیا۔ دہلی سے براہِ راست فلائٹ چار گھنٹوں میں جدہ پہنچ جاتی ہے۔

جدہ ہم لوگ پہنچے تو سعودی عرب کے حساب سے ۱۱½ اور ہندوستان کے حساب سے دو بجے تھے۔ مغرب اور عشار کی نماز کافی تاخیر سے ایرپورٹ پر ادا کی۔ اس کے بعد ضابطہ کی طول طویل اور تھکا دینے والی کارروائی شروع ہوئی۔ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ (حج کے موقع پر ایک عرب دوست اور معروف شخصیت کی مہربانی سے ضابطہ کی کارروائیوں سے بچا رہا) اس کارروائی کو اور تیز کیا جا سکتا ہے اور زحمتوں سے بچا جا سکتا ہے معلوم ہوا کہ حاجیوں کے جو مخصوص جہاز ہوتے ہیں ان سے نمٹنے میں اور بھی کئی گھنٹے مزید لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان سے جو حاجی آئے تھے ان میں سے چار افراد سب سے پہلے صبح چار بجے کے قریب مکہ مکرمہ روانہ ہوئے ان میں خوش قسمتی سے ہم دونوں بھی تھے۔ باقی حجاج کا تعلق پاکستان سے تھا۔ راستے میں نماز فجر ادا کی۔ مکہ مکرمہ میں معلم کے آفس پہنچے تو سات بج چکے تھے۔ معلم کے پاس پاسپورٹ جمع ہو جاتے ہیں ان کی جگہ ایک کارڈ ملتا ہے جو حج سے واپسی تک پاسپورٹ کا بدل ہوتا ہے۔ منیٰ اور عرفات کے قیام کے لیے بھی الگ سے کارڈ ملتا ہے۔ ہاتھ میں ڈالنے کے لیے پلاسٹک کا ایک پٹا ہوتا ہے جس میں معلم کا نام اور پتا لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے معلم کا نام محمد اسماعیل المؤذن ہے۔

سعودی عرب کے رفیقوں اور دوستوں نے یہ پہلے ہی سے طے کیا تھا کہ ہمارا قیام انہی کے درمیان رہے گا اور انہی کے ساتھ حج ہوگا چنانچہ معلم کے آفس سے میں نے برادرم جناب محمد اسماعیل صاحب کو فون کیا تو تھوڑی ہی دیر میں وہ اور ان کی اہلیہ پہنچ گئیں ساتھ میں برادرم ریاض صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ ہم دونوں کو ڈاکٹر محمد آصف علی صاحب کے مکان لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر رفیعہ صاحبہ 'مستشفی الولادۃ' جرول میں سروس میں ہیں۔ مکان اسی کے قریب ہے۔ دونوں کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔

عمرہ کی ادائیگی

ہم لوگوں کو اب عمرہ کرنا تھا۔ رفیق محترم جناب صداقت علی صاحب طے شدہ پروگرام کے تحت عصر سے پہلے تشریف لے آئے۔ عصر کی نماز حرم میں ادا کی۔ حرم کا پورا ماحول طہارت اور پاکیزگی کا ماحول ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف تقدس کا ہالہ موجود ہے اور ہر طرف نیکی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ حرم

کو دیکھئے اور دیکھتے ہی رہئے۔ یہاں ہر آن رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق فیض یاب ہو سکتا ہے۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گلچینِ تو بہ تنگیٔ داماں گلہ دارد

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کو دیکھتے تو فرماتے اللھم زد ھٰذا البیت تشریفًا وتعظیما (اے اللہ اس گھر کی عظمت اور قدر و منزلت میں اضافہ فرما) یہ مسنون دعا اس گھر کی عظمت کا احساس دلاتی ہے اسے بھولنا نہیں چاہیے۔

نماز عصر کے بعد ہم دونوں نے طواف کیا۔ صداقت علی صاحب بھی طواف میں ساتھ رہے۔ کعبۃ اللہ کو دیکھتے ہی دل بے چین ہو جاتا ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ خدا کا وہی گھر ہے جس کی طرف رخ کر کے زندگی بھر نماز پڑھی اور جب تک حیات مستعار ہے انشاء اللہ پڑھتے رہیں گے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے در و دیوار سے چمٹ جائیں جس گھر کو یہ مقام حاصل ہو کہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کا قبلہ ہو، عبادت میں جس کی طرف رخ کرنا ضروری ہو اور اس سے رخ پھر جائے تو نماز نماز نہیں ہوتی، اس کی عظمت کن الفاظ میں اور کس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔ انہی احساسات کے ساتھ خانہ کعبہ کو دیکھتا اور کبھی اپنی خوش بختی پر مسرت سے جھوم اٹھتا اور کبھی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں کہ ان سیہ کار آنکھوں سے خدا کے اس مقدس گھر کو کیسے دیکھا جائے؟ اس کے لیے تو طہارت میں ڈوبی ہوئی اور توبہ و استغفار سے دھلی ہوئی آنکھیں چاہئیں کاش وہ آنکھیں ملتیں جو اس کے شایانِ شان ہوتیں۔

تھوڑی دیر غلاف کعبہ کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پہلے بھی بارہا دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس سیاہ پردہ سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں اور پورا ماحول روشن اور تاباں ہو رہا ہو۔ خیال ہوا کیا اس میں میری جذباتیت کا دخل ہے یا میں خاص قسم کی مذہبی نفسیات کا شکار ہوں۔ جلد ہی یہ خیال مٹ گیا۔ اس لیے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مرکز ہدایت ہے۔ یہ بقعۂ نور ہے۔ یہیں سے نورِ ہدایت پھیلا اور عام ہوا۔ سرزمین مکہ سے جو آفتاب طلوع ہوا اس سے ساری دنیا چمک اٹھی۔ اگر اس سے نور نکلتا ہوا محسوس ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خانہ کعبہ کا طواف حج اور عمرہ کا جزء اور ایک بڑی عبادت ہے۔ طواف کرتے ہوئے۔

انسان عجیب کیفیات سے سرشار ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی تمنائیں اور مرادیں لے کر بے سرو سامانی کے لباس میں خدا کے گھر کا طواف کرتا اور اس کے گرد چکر کاٹتا ہے تو خدا تعالیٰ کا جذبہ کرم بھی جوش میں آجاتا ہوگا۔ میں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ اس گھر کا طواف کر رہا تھا۔ دل سے صدا بلند ہوئی۔ اے اللہ! یہ فقیر بے نوا تیری نوازش کا طالب ہے۔ تو اس کا دامن بھر دے۔ وہ تیرے در سے خالی ہاتھ نہ جائے۔

ہم لوگوں نے عصر کے بعد طواف کیا اور طواف کے بعد سعی کی۔ اتنے میں عشاء کا وقت ہوگیا۔ عشاء سے فارغ ہونے کے بعد بالوں کا قصر کرایا اور دیر گئے ڈاکٹر آصف صاحب کے مکان پہنچے جو ہماری قیام گاہ تھی۔

جب تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا پینے کے لیے زمزم کا استعمال خوب رہا۔ زمزم کو خوب جی بھر کر پینے کا حکم ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے ماء زمزم لما شرب لہ یعنی زمزم جس مقصد کے لیے پیا جائے وہ پورا ہوگا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ زمزم بھوک اور پیاس دونوں میں کام آتا ہے۔ بہت سے اللہ کے بندوں کا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کھڑے ہو کر پیا تھا۔ اس لیے کھڑے ہو کر پینا سنت ہے۔ اس وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے اللھم انی اسئالک علما نافعا ورزقا واسعا وشفاء من کل داء۔ حرم میں ہر طرف زمزم کے کنسٹر موجود رہتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔ باہر نل لگے ہوئے ہیں۔ یہاں سے زمزم لے جایا بھی جاسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس سے وضو کرتے اور منھ ہاتھ دھوتے ہیں۔

۲۹ مارچ ۹۷ء کو بعد عصر ہم دونوں جناب ریاض احمد صدیقی صاحب کے ساتھ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے نکلے۔ ان مقامات کی میں پہلے بھی زیارت کر چکا تھا لیکن اہلیہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ حج سے پہلے ان مقامات کا دیکھ لینا مفید ہوتا ہے۔ ایام حج میں مجمع کی کثرت اور حج کی مصروفیت کی وجہ سے ان کے بارے میں پوری معلومات نہیں ہو پاتیں۔ ریاض صاحب خاصے طویل عرصے سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں۔ ان کی معلومات بھی وسیع ہیں۔ انھوں نے ان مقامات کے کچھ نقشے بھی مرتب کیے تھے۔ ان کی معلومات سے فائدہ پہنچا اور بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔ فتح مکہ کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جس راستے سے داخل ہوئے۔ اس سے ہماری گاڑی گزری شعب ابی طالب کو اچھی

طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ وابستہ ہے جو بتاتی ہے کہ دعوت حق کی راہ کن پرخار وادیوں سے گزرتی ہے۔ شعب ابی طالب اب اپنی اصل شکل میں نہیں ہے۔ اسے کاٹ کر وسیع سڑکیں نکال دی گئی ہیں۔ اسے اب شعب علی کہا جاتا ہے۔ وادی بیعت عقبہ دیکھی جس بیعت نے اسلام کی دعوت کو ایک نیا رخ دیا اور فتح و کامرانی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ منیٰ پہنچے، مسجد خیف دیکھی جس کا ایک حصہ حدود حرم میں اور ایک حصہ حدود حرم سے باہر ہے۔ نہر زبیدہ کے نشانات دیکھے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور استعمال میں نہیں ہے لیکن اس میں انجینیرنگ کا کمال یہ ہے کہ اتنی لمبی نہر اونچے نیچے راستے سے اور پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی تھی لیکن اس کی سطح (Level) ہموار تھی۔ کہیں فرق نہیں آنے پایا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے پانی پہنچ نہیں سکتا تھا۔ میدانِ عرفات پہنچے۔ جبلِ رحمت گئے جہاں سے آپ نے حجۃ الوداع کا تاریخی خطبہ دیا تھا۔ انسانی حقوق کی حفاظت، نوع انسانی کی ہمدردی اور کمزوروں کی بہی خواہی میں اس جیسا خطبہ تاریخ کبھی سن نہیں سکی۔ راستے میں مغرب کا وقت ہوگیا۔ سڑک کے کنارے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور سیدھے حرم پہنچ گئے۔ دیر تک خدا کے گھر میں بیٹھے رہے۔ نماز عشاء حرم میں پڑھی۔ اس کے بعد ریاض صاحب نے ہمیں اپنے مستقر پر پہنچا دیا۔

محترم سید صداقت علی صاحب نماز فجر سے پہلے ڈاکٹر آصف صاحب کے ہاں پہنچ جاتے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں یہ اہتمام تھا کہ نماز سے پہلے ہی ہم دونوں کے لیے اور ہمارے ساتھ صداقت صاحب کے لیے بھی چائے تیار ملتی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہم دونوں کو اپنی گاڑی سے حرم پہنچا دیا کرتے۔ نماز فجر کے بعد جب تک جی چاہتا ہم دونوں حرم میں قیام کرتے اور کوشش یہ ہوتی کہ ہر روز طواف کی سعادت بھی حاصل ہو۔ پھر کوئی نہ کوئی دوست آتے اور ہمیں ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچا دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر حرم سے قریب تھا۔ دس منٹ میں سواری ان کے گھر پہونچ جاتی۔

۳۱ مارچ / ۲۱ ذی قعدہ کو ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچ کر ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ حسین ذوالقرنین صاحب تشریف لے آئے۔ دعوت و تبلیغ کے موضوع پر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ لندن میں اس مقصد کے لیے ایک سینٹر قائم ہے اس سے وہ متعلق ہیں عصر کے بعد صداقت صاحب کے ساتھ ہم دونوں حرم پہنچے۔ ہم دونوں کے ساتھ صداقت صاحب

نے بھی طواف کیا۔ نماز مغرب کے بعد واپسی ہوئی۔

مدینہ منورہ روانگی

آج بعد عشاء مدینہ منورہ روانگی ہے۔ عشاء کے بعد روانگی طے ہوئی ہے لیکن ضابطہ کی طول طویل اور بظاہر غیر ضروری کارروائیوں کے نتیجے میں شب میں بارہ بجے بس روانہ ہوئی۔ صداقت صاحب اور تمیز الدین صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ ہم لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ اتنی دیر تک انھیں انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ ان سب باتوں پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن اس کی طرف شاید توجہ نہیں ہوتی۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک کا فاصلہ چار سو نبیس[۴۲] کلومیٹر اور جدہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ تین سو چھیانوے[۳۹۶] کلومیٹر ہے۔ سڑک وسیع، کشادہ اور دورویہ ہے۔ اس پر چھ گاڑیوں کی بیک وقت آسانی سے آمد و رفت ہو سکتی ہے۔ تین گاڑیاں ایک طرف سے اور تین گاڑیاں دوسری طرف سے۔ آمد و رفت کے راستے الگ الگ ہیں۔ درمیان میں بیس میٹر جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ اس شاندار سڑک پر زیادہ سے زیادہ چار ساڑھے چار گھنٹے کے اندر مکہ یا جدہ سے مدینہ پہونچا جا سکتا ہے۔ لیکن بس ڈرائیوروں کی بے نیازی اور ضابطہ کی کارروائیوں میں پوری رات گزر جاتی ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے بھی رات جاگ کر گزاری اور صبح ساڑھے آٹھ بجے بس نے ہمیں مدینہ منورہ میں حرم کے قریب اتار دیا۔ رفقاء نے بتایا کہ یہ کم وقت لگا ہے۔ بالعموم اس سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ چنانچہ واپسی پر ہمیں اس کا تجربہ بھی ہوا۔ سڑک پر اتر کر میں نے اپنے رفیقوں کو فون کرنا چاہا۔ میرے پاس سعودی سکے تو تھے لیکن قریب میں جتنے ٹیلی فون بوتھ تھے ان میں کارڈ سسٹم تھا اور کارڈ میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ایک دوکان دار سے فون کرنے کی درخواست کی اس نے بخوشی نمبر ملا دیا۔ فون پر بات ہوتے ہی جناب مسیح الرحمٰن صاحب، جناب عارف الحق صاحب اور جناب عبدالرزاق صاحب پہنچ گئے۔ حرم سے قریب ہی انھوں نے ہم دونوں کے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ اس کمرہ میں پہنچا دیا۔ وہیں ناشتہ کیا۔ عبدالرزاق صاحب دوپہر کا کھانا لے کر عارف صاحب کے ساتھ پہنچے۔ میں نے عرض کیا۔ کھانے کی زحمت نہ کریں۔ ہم لوگ خود اس کا انتظام کر لیں گے۔ لیکن عبدالرزاق صاحب نے کہا۔ کہ ہم نے آپ کی خواہش پر کمرہ تو لے رکھا

ہے لیکن ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ ہمارے گھر قیام کریں۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں سے حرم قریب ہے۔ پانچوں وقت نماز کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے انھوں نے کہا کہ ہم حرم میں آپ کی پانچوں وقت کی نماز کا انتظام کر دیں گے۔ گھر پر ٹیلیفون کی سہولت ہے۔ دوست و احباب آپ سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ بہرحال ان کا اصرار اس حد تک بڑھا کہ ہم اسی روز عبدالرزاق صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ عبدالرزاق صاحب۔ ان کی اہلیہ اور ان کے بچے ہماری ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہر طرح کا آرام رہا۔

جناب عارف الحق صاحب، نذیر احمد صاحب اور جناب حامد صاحب ہم لوگوں کو نماز کے لیے حرم پہنچاتے۔ جب تک ہمارا جی چاہتا ہم لوگ وہاں رہتے پھر کوئی رفیق آتے اور ہمیں والپس لے جاتے۔ البتہ نماز ظہر کبھی کبھی قریب کی مسجد میں ادا ہوتی رہی۔ مسجد نبوی میں چالیس فرض نمازیں ادا کرنے کا رواج سا ہو گیا ہے۔ اس کا بڑا ثواب بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے کم از کم ایک ہفتہ قیام کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ اجر و ثواب کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اس رواج عام کی ہم سے پابندی نہ ہوئی اور نہ ہم یہ چاہتے تھے۔ اس کے باوجود۔ ہم دونوں کو تقریباً چالیس نمازیں ادا کرنے کی سعادت ملی۔

مکہ مکرمہ اور کعبۃ اللہ کے بعد ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ پرکشش مقام مدینہ منورہ اور مسجد نبوی ہے۔ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی لیکن جب دیکھئے حرم نبوی میں نئی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اس کی تعمیر میں وہ مقدس ہستی شریک تھی جو سید الناس تھی اور اس کے وہ ساتھی معاونت کر رہے تھے جن کو "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" کہا گیا ہے۔ میں بیٹھا اس ہستی کے بارے میں سوچنے لگا جس کے اشارۂ چشم و ابرو پر اس کے ساتھیوں کی جانیں نثار ہوتی تھیں جس کا ہر عمل امت کے لیے نمونہ تھا۔ جس کی پوری زندگی اسوۂ حسنہ تھی۔ جس کے نقشِ قدم سے رہنمائی ملتی تھی جس نے زہد فی الدنیا کے ساتھ حکمرانی اور سیاست کا بھی درس دیا۔ جس کی راتیں خدا کی عبادت میں اور جس کے دن اس کے دین کی دعوت و تبلیغ اور سربلندی کی جدوجہد میں صرف ہوئے تھے، جس کے اردگرد دنیا کی دولت امنڈ آئی لیکن اس نے ایک مسافر کی طرح زندگی بسر کی۔

مالی وللدنیا وما انا وللدنیا　　میرا دنیا سے کیا تعلق؟ میرا دنیا سے

الا کراکب استظلّ تحت	سے بس اتنا ہی تعلق ہے جیسے کوئی سوار
شجرۃ ثم راح وترکہا	کسی درخت کے نیچے سایہ میں ٹھہر جائے پھر
(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)	چل پڑے اور اسے چھوڑ دے۔

بوریا ممنونِ خواب راحتش تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

جس ہستی کے ذریعے دنیا کو علم کی روشنی ملی۔ مکارم اخلاق، اعلیٰ سیرت، ہمدردی وبہی خواہی ملی، عدل وانصاف کی دولت ملی، حقوق ملے، کمزور کو طاقت ملی، زور آور کو احساس ہوا کہ وہ قانون کے سامنے لاچار اور بے بس ہے۔

اتنا عظیم کارنامہ جس کی کوئی مثال پیش کرنے سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں کیسے انجام پایا یا؟ کن حالات میں انجام پایا؟ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے لیکن اس وقت حرم نبوی کی مقدس فضا میں جہاں زور سے سانس لیتے ہوئے بھی دل کانپ جاتا تھا۔ میں نے قرآن مجید سے اس کا مطالعہ کرنا چاہا۔ میں نے سورۂ احزاب سورۂ نور، سورہ محمد، سورہ فتح، سورۂ حجرات سے لے کر سورۂ مجادلہ اور سورۂ طلاق تک پڑھنا شروع کیا۔ پڑھ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے دور مبارک کی تصویر پاکیزہ فلم کی طرح ابھر رہی تھی۔ پھر بے اختیار سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ، سورۂ انفال، سورہ توبہ، غرض تمام مدنی سورتیں پڑھیں کچھ عجیب کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ کبھی اللہ کی کتاب پڑھتا، کبھی آنکھیں بند کر لیتا کبھی مصحف ہاتھ میں ہوتا اور کبھی دونوں زانوؤں کی زینت بنتا۔ سوچتا کیسا مبارک انقلاب تھا، کن نازک حالات میں برپا ہوا، کیسی مخالفتیں ہوئیں؟ کیا کیا سازشیں کی گئیں؟ ان کے جواب میں کیا تدبیریں اختیار کی گئیں اور کیا حکمت و دانائی تھی جن کا بروقت مظاہرہ ہوتا رہا۔ قرآن مجید کی تلاوت کا ایک نیا لطف آیا۔ محسوس ہوا کہ کچھ نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ میں ایک ایسے عالم کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے دیکھنے کی تمنا سب سے بڑی تمنا ہے۔ کیا معلوم کہ یہ تمنا کب پوری ہوگی اور وہ صبح سعادت کب طلوع ہوگی جس نے پوری دنیا کو روشنی سے بھر دیا تھا۔

کسی بھی مسجد میں نماز پڑھنے کا جو ثواب ہے اس سے ہزار گنا مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کا ثواب ہے اور بیت اللہ میں نماز ادا کرنے کا ثواب تو ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

صلوٰۃ فی مسجدی ھٰذا	میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں
خیر من الف صلوٰۃ فیما	کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔ مسجد حرام
سواہ الا المسجد الحرام	اس سے مستثنیٰ ہے (اس کا ثواب
(بخاری و مسلم)	اس سے زیادہ ہے)

جب یہ حدیث ذہن کے پردے پر ابھرتی تو جی چاہتا کہ نماز کے لیے کھڑا ہو جاؤں۔ مسجد حرام کی نمازیں بھی عام نمازوں کی طرح غفلت ہی کی نمازیں رہیں لیکن کبھی کبھی ایک طرح کا کیف و سرور اور لذت بھی محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے خدا کے حضور کھڑا ہوں۔ گناہوں کا احساس ابھر رہا ہے۔ دل کا زنگ دور ہو رہا ہے اور خدا سے قربت کا لطف مل رہا ہے۔ ایسے میں دعاؤں کی لذت بھی ملی۔ خدا سے مانگنے میں جو لذت ہے اسے کن الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے؟

مسجد نبوی جو اسلامی مملکت کا مرکز تھی۔ جہاں سے پورے حجاز پر حکومت ہو رہی تھی۔ اس کی لمبائی صرف سو ہاتھ تھی اور چوڑائی بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ گویا مسجد کی شکل مربع تھی۔ بنیاد تین ہاتھ کھودی گئی تھی۔ بنیادیں پتھر کی اور دیواریں اینٹ کی تھیں۔ کھجور کے تنوں کے ستون تھے۔ کھجور ہی کے پتوں کی چھت تھی۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر اسے چھو سکتا تھا۔ بارش میں چھت ٹپکتی تھی۔ بعد میں چھت مٹی سے پاٹی گئی۔ مسجد کی تعمیر میں سات ماہ یا ایک سال کے قریب وقت لگا۔ فرش کنکریوں کا تھا۔ خیبر کے بعد مزید توسیع ہوئی۔ حضرت عثمان نے اس کے لیے زمین خرید کر وقف کی تھی۔ مسجد کے آخری حصے میں صفہ تھا۔ اس پر چھت پڑی ہوئی تھی۔ یہ غالباً مسجد کے بعد تعمیر ہوا جب مہاجرین کی تعداد زیادہ ہو گئی اور ان میں سے بعض کے قیام کا انتظام نہ تھا تو صفہ ان کا مسکن تھا جو لوگ یہاں قیام پذیر تھے اور دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی معاش کا کوئی مستقل نظم نہ تھا۔ رات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف صحابہ کے یہاں ان کے کھانے کا نظم فرماتے تھے۔ دن میں یہ حضرات اپنے طور پر کچھ معاشی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔

حضرت عمر کے زمانے میں مسجد میں آگے کی طرف توسیع عمل میں آئی۔ حضرت عثمان نے مزید توسیع کی۔ بعد میں اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ اب حرم میں غیر معمولی توسیع ہو گئی ہے اور اس کا انتظام بھی قابلِ رشک ہے۔

قرآن مجید کی ہدایت ہے:

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اپنی آواز
صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا	نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے
لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ	ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح
لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ	تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ	ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب
(الحجرات: ۲)	غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کا احترام ضروری ہے۔ اس کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی اس مسجد میں شور وغل نہ ہو اور ہر آن ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے دو آدمیوں کو مسجد نبوی میں لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ دریافت فرمایا کہ تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو؟ انھوں نے عرض کیا طائف سے تعلق ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم مدینہ کے ہوتے تو میں تمہیں اس بے ادبی پر سزا دیتا۔ (چونکہ باہر سے آئے ہو اور مسجد نبوی کے آداب سے واقف نہیں ہو اس لیے نظر انداز کیا جا رہا ہے)

مدینہ منورہ کی زیارت اور مسجد نبوی میں نماز حج کا جز نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ احرام وغیرہ کی شرط نہیں ہے۔ کسی بھی مہینے میں اور کسی بھی دن زیارت ہو سکتی ہے۔ حج کے مہینوں کی شرط نہیں ہے۔ لیکن حج کو جانے والے مسجد نبوی کی زیارت سے محروم رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس سے بڑی محرومی ہو بھی کیا سکتی ہے کہ آدمی حج کے لیے مکہ مکرمہ جائے اور مدینہ منورہ نہ پہنچے۔ خاص مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی کی زیارت کے ارادے سے سفر کی اجازت ہے البتہ کسی اور عبادت گاہ کے لیے خاص طور پر سفر کرنا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تشدّ الرحال الا الی	تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد
ثلاثة مساجد مسجد الحرام	کے لیے (ثواب کی نیت سے) سفر نہیں کیا
ومسجد الاقصیٰ ومسجدی	جائے گا۔ وہ ہیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور
هٰذا۔ (بخاری وسلم)	میری یہ مسجد

۴ اپریل کو جناب عارف الحق صاحب کے ساتھ ہم دونوں نماز فجر کے لیے

مسجد نبوی پہنچے۔ طے شدہ پروگرام کے تحت نماز سے فارغ ہونے کے بعد عزیزم محی الدین غازی فلاحی اور عزیزم عبداللہ حماد بھی حرم پہنچ گئے۔ یہ مختصر قافلہ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ یہ مقامات میری اہلیہ کے لیے نئے تھے لیکن جب دیکھئے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ ہماری تاریخ وابستہ ہے۔ جبل احد پہنچے۔ جنگ احد یاد آگئی۔ فتح کے بعد شکست کھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا اس میں بعض کمزوریاں بھی سامنے آئیں اور ان کی اصلاح کی ہدایت کی گئی۔ ایک موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هٰذا جبل احد يحبّنا	یہ احد پہاڑ ہے۔ یہ ہم سے محبت کرتا
ونحبّه	ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو کمزور ذہن اس جگہ کو بھی منحوس اور نامبارک سمجھنے لگتے ہیں جہاں وہ واقعہ پیش آیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا ممکن ہے یہی پس منظر ہو۔ آپ نے بتایا کہ شکست کا اس پہاڑ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

اس کے بعد شہدا کا قبرستان دیکھا۔ دعا کے لیے بے اختیار ہاتھ اٹھ گئے۔ مسجد قبلتین پہنچے جہاں تحویل قبلہ کے حکم کے بعد نماز کا رخ بدل دیا گیا تھا۔ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جا رہی تھی۔ اسی حالت میں کعبہ کی طرف رخ کر لیا گیا۔ مسجد قبا دیکھی جس کی تعریف میں قرآن نے کہا ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى	جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی
مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ	ہے وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے
فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ	کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے
اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ	ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک
الْمُطَّهِّرِيْنَ	رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار
(التوبہ: ۱۰۸)	کرنے والے ہی پسند ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت مدینہ پہنچنے سے پہلے اس میں نماز ادا کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں: ہر شنبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پیدل اور کبھی سواری پر اس مسجد میں تشریف لے جاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے (بخاری و مسلم) وہاں دو رکعت نماز

ادا کرنے کی توفیق ملی۔ آگے بڑھ کر بئر (کنواں) سلمان انصاری دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے یہاں کھجور کا ایک درخت لگایا گیا تھا جو صدیوں باقی رہا۔ کعب بن اشرف یہودی کا قلعہ عبرت کے ساتھ دیکھا۔ جبل محروق کے قریب سے گزرے خندق کے نشانات تو محفوظ نہیں ہیں البتہ سبع مساجد جو مختلف صحابہ کرام کے نام سے موسوم ہیں، موجود ہیں۔ انھیں دیکھنے کا موقع ملا۔ چار پانچ گھنٹے کے سفر سے واپسی ہوئی۔ تھوڑی دیر آرام کیا، ناشتے اور غسل سے فارغ ہوئے اور جمعہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد روضۂ مبارک پر حاضری دی۔ باچشم تر سلام عرض کیا۔ کتنی بڑی سعادت ہے کہ ہر امتی کا سلام شاہِ دوعالم کی خدمت میں پیش ہوتا رہتا ہے۔ توقع ہے ہم جیسے گناہ گار بھی اس سعادت سے محروم نہ ہوں گے۔ میرا سلام بھی ضرور پہنچا ہوگا۔ اللھم صل علی محمد وبارك وسلم کئی دن کی کوشش کے بعد آج روضۃ الجنۃ میں دو رکعت ادا کرنے کی سعادت ملی۔

ما بین بیتی ومنبری روضۃ	میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کا
من ریاض الجنۃ، ومنبری	حصہ جنت کے باغات میں سے ایک
علی حوضی (بخاری ومسلم)	باغ ہے اور میرا منبر حوض کوثر پر ہے۔

جس حصہ زمین پر صبح وشام خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑتے رہے ہوں۔ جہاں جبینِ مبارک خدا کے دربار میں سجدہ ریز رہی ہو وہ یقیناً جنت ہی کا ایک ٹکڑا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کچھ بعید نہیں یہ ٹکڑا جنت ہی کا ایک ٹکڑا ہو گو وہ دیکھنے میں عام زمین ہی کی طرح ہے۔ جس خدائے رحیم وکریم نے جنت کے اس حصہ پر سجدہ کرنے کی توفیق دی۔ توقع ہے کہ اپنے فضلِ خاص سے آخرت میں بھی اسے جنت سے سرفراز فرمائے گا۔ حرم میں یہ جو وقت گزرا اس میں رفیق محترم نذیر احمد صاحب ساتھ تھے۔ ڈاکٹر کلیم الرحمٰن صاحب کی اہلیہ اور میری اہلیہ بھی جمعہ کے لیے گئیں اور اس احساس کے ساتھ بعد عصر واپس ہوئیں کہ حرم نبوی میں جو لمحات بھی گزر جائیں وہ زندگی کے قیمتی لمحات ہیں۔

آج ۸ راپریل ذی قعدہ کی آخری تاریخ ہے اور مدینہ منورہ کی آمد پر آٹھ دن گزر چکے ہیں۔ نواں دن شروع ہو چکا ہے۔ فجر، ظہر، عصر، ہم دونوں کی حرم میں ادا ہوئی۔

عبدالرزاق صاحب اوران کے بھتیجے خالد صاحب ساتھ تھے۔ آج ہی دوبارہ مکہ روانگی ہے۔ دعا کی۔ اس طرح دعا کی جس طرح ایک غافل انسان دعا کرتا ہے لیکن اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے جب یہاں پہنچایا ہے تو توقع ہے کہ اپنے فضل وکرم سے بے جان الفاظ میں جان بھی ڈال دے گا اور ایک غافل انسان کی دعائیں بھی قبول کرے گا۔ صلوٰۃ وسلام ہو اس مقدس ہستی پر اور اس کے ساتھیوں پر جس کے صدقے میں ایمان واسلام کی دولت ملی۔ خدایا بار بار حاضری کا موقع عنایت فرما۔ جی نہ بھرا ہے نہ بھر سکتا ہے۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران جامعہ مدینہ منورہ کے بعض ہندوستانی طلباء اور ریسرچ اسکالرس سے دوبار تفصیلی ملاقات رہی۔ وقت کے علمی اور فکری مسائل اور ان کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ فقہی اختلافات میں صحیح نقطہ نظر واضح کیا گیا اور مسلکِ سلف پر بھی گفتگو رہی۔

بعض اور احباب اسی طرح کے موضوعات پر گفتگو کے لیے جدہ سے مکہ مکرمہ پہونچے اور میری گزارشات ٹیپ کیں۔

مدینہ سے واپسی

۸ راپریل بعد عصر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے لیے روانگی ہوئی۔ عارف الحق صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے رخصت کے لیے بس اڈے پہنچایا لیکن غیر معمولی تاخیر ہوتی رہی مغرب وعشاء وہیں ادا کی۔ شب میں آٹھ بجے کے قریب بس روانہ ہوئی۔ اتنی دیر تک ان دونوں رفیقوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ مدینہ کے راستے سے مکہ مکرمہ آنے والوں کے لیے میقات ذوالحلیفہ ہے۔ میقات کی تعیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہل اھل المدینۃ من ذی الحلیفۃ	اہل مدینہ (حج اور عمرہ کے لیے) ذوالحلیفہ
واھل الشام من الجحفۃ واھل نجد	سے تلبیہ پڑھیں گے اہل شام جحفہ سے،
من قرن، ویہل اھل الیمن من یلملم	اہل نجد قرن منازل سے اور اہل یمن
(بخاری، کتاب الحج، باب میقات اہل المدینۃ، مسلم)	یلملم سے۔

کتاب الحج، باب مواقیت الحج والعمرہ۔ مزید روایات
بخاری و مسلم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

تلبیہ کے الفاظ ہیں :

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا	میں حاضر ہوں اے اللہ حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ تیرا
شریک لک ان الحمد و	کوئی شریک نہیں بے شک فضل و احسان
النعمۃ لک والملک لاشریک لک	تیرا ہی ہے، سلطنت و اقتدار تیرا ہی ہے
(حوالہ سابق، باب التلبیۃ)	تیرا کوئی شریک نہیں۔

ہند و پاک کے لوگوں کے لیے میقات یلملم ہے۔ ذوالحلیفہ مدینہ منورہ سے آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے تقریباً بیس منٹ میں بس میقات پر پہنچ گئی۔ یہاں زائرین کے لیے بڑے ہی نفیس اور عمدہ انتظامات ہیں۔ صاف ستھری اور وسیع مسجد، جدید قسم کے غسل خانے، غسل اور وضو کے لیے گرم اور ٹھنڈا پانی۔ بہت کچھ موجود ہے۔ لیکن ناواقفیت کی وجہ سے بعض لوگ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ ہماری بس سڑک کے کنارے رکی۔ میقات پر وضو اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے احرام باندھا اور ہم دونوں باہر آئے تو بس اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ بعض لوگوں نے تلاش میں مدد دی۔ لیکن بس نہیں ملی۔ کافی دیر پریشان رہے ۹½ کے بعد بس ملی۔ غالباً اس کی جگہ بدل گئی تھی۔ ۱۲ بجے ایک جگہ بس رکی تو اس طرح رکی کہ ڈرائیور صاحب کا پتہ ہی نہ چلا۔ کہیں آرام فرما رہے تھے۔ اب ڈھائی بج چکے تھے۔ مسافر سخت پریشان تھے۔ ڈرائیور صاحب تشریف لائے۔ مسافروں نے ناگواری کا اظہار کیا۔ لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تین بجے کے قریب بس چلی۔ تھوڑی دیر کے بعد نماز فجر کے لیے رک گئی۔ اس طرح ۹ اپریل کو ۸½ بجے کے قریب مکہ مکرمہ پہنچے۔ معلم کی ٹیکسی نے ڈاکٹر محمد آصف علی کے گھر پہنچا دیا۔ تکان اتنی زیادہ تھی کہ عمرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

۱۰ اپریل ۲ ذی الحجہ کو ہم دونوں نے حرم میں نماز فجر پڑھی۔ اس کے بعد عمرہ ادا کیا۔ ہجوم کی وجہ سے کافی وقت لگا۔ تکلا ہر رکن ادا ہو رہا ہے لیکن روح اور جذبے سے خالی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے تحت بظاہر جو دوڑ دھوپ ہو رہی ہے اسے وہ روح سے بھر دے اور اپنے فضل خاص سے قبول فرمائے۔

آج ۱۵ اپریل اور ۸ ذی الحجہ ہے۔ اب ایام حج شروع ہو چکے ہیں۔ ہمارا حج معلّم کے ساتھ نہیں ہے۔ برادرم جناب ارشد سراج الدین صاحب کچھ افراد کے ساتھ حج کرتے ہیں۔ اب کی بار چالیس سے زاید افراد کا انھوں نے نظم کیا تھا۔ دوستوں نے طے کیا کہ ہمارا حج بھی اسی قافلے کے ساتھ ہو۔ قافلہ کے بیشتر افراد صبح منیٰ پہنچ گئے۔ ہمارا پروگرام بھی سویرے ہی پہنچنے کا تھا لیکن بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے ارشد سراج الدین صاحب پانچ سات افراد کو جن میں ہم دونوں بھی شامل تھے ۱۱½ بجے لے کر روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی جب منیٰ کی طرف روانہ ہوئی تو ہم نے دور ہی سے دیکھا کہ منیٰ میں زبردست آگ لگی ہوئی ہے۔ دھواں بادل کی طرح اٹھ کر افق پر چھا رہا ہے۔ جب ہم منیٰ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ احتیاطاً راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ ہم لوگ مجبوراً پانچ بجے تک ایک جگہ رکے رہے۔ اس کے بعد منیٰ پہنچے۔ اس وقت تک آگ بجھ چکی تھی اور نئے انتظامات ہو رہے تھے۔ ہمارا کیمپ جائے حادثہ سے دور اور جمرات کے قریب تھا۔ الحمدللہ کیمپ کے لوگوں کا جانی اور مالی کوئی نقصان نہیں ہوا۔

منیٰ میں آگ لگنے کے چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن حالیہ برسوں میں غالباً یہ سب سے بڑا حادثہ ہے جس میں ستّر اسّی ہزار خیمے جل کر راکھ ہو گئے۔ سینکڑوں افراد جاں بحق ہو گئے جن میں زیادہ تر کا تعلق ہندوستان، پاکستان اور ایران سے بتایا جاتا ہے۔ بدحواسی، پریشانی اور جان بچانے کی فکر کی یہ کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ بہت سے لوگوں کو راستہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر بھاگیں۔ کچھ لوگ پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لوگ حرم کی طرف بھاگ رہے تھے اور کچھ لوگ مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ مال و اسباب کے نقصان کا اندازہ نہیں کیا جا سکا اور شاید اس کا اندازہ کرنا مشکل بھی تھا۔ یہ آگ کیسے لگی؟ کہاں سے شروع ہوئی۔ کہاں تک پھیلی؟ اس میں کس کی بے احتیاطی کا دخل ہے؟ اس پر بروقت کنٹرول کیا جا سکتا تھا یا نہیں؟ اس پر بہت بحث ہو چکی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی اور اس کے اسباب تلاش کیے جاتے رہیں گے لیکن منیٰ اور عرفات میں جہاں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے۔ غالباً اب کی بار بیس لاکھ کا مجمع تھا۔ بعض باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو خیمے فائر پروف ہونے چاہئیں۔ اس کے باوجود آگ لگنے کا امکان ہے۔ اس کے لیے آگ بجھانے کا معقول

انتظام بڑے بڑے خیموں میں ضرور ہونا چاہیے۔ خیمے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ وقتِ ضرورت آدمی نکل کر بھاگنا چاہے تو بھی بھاگ نہیں سکتا۔ ان کے درمیان فاصلہ ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ منیٰ اور عرفات میں حکومت کے عملے اور مہمانوں کے لیے مخصوص کیمپ نہ ہوں۔ اس سے جگہ بہت گھرتی ہے۔ جس طرح مسجد میں لوگ چھوٹے بڑے کے فرق کے بغیر نماز ادا کرتے ہیں اسی طرح انھیں بھی مناسک حج ادا کرنے چاہئیں۔ تیسرے یہ کہ منیٰ اور عرفات میں گیس سلنڈر، اسٹو یا کوئی بھی آتش گیر مادہ لے جانے کی ممانعت ہونی چاہیے اور تیار کھانا فراہم کیا جانا چاہیے۔ حجاج کو بھی حج کے زمانے میں اس طرح کا کھانا چاہیے وہ ان کے ذوق کے مطابق نہ ہو گوارا کرنا چاہیے۔

رات منیٰ میں گزری۔ منیٰ میں نمازیں قصر پڑھی جاتی ہیں۔ اس حادثہ اور اس کے نتیجے میں جو دوڑ بھاگ ہوئی اس میں نماز، ذکر و فکر اور عبادت کا کوئی اہتمام نہیں ہو سکا۔ جگہ کی شدید کمی بھی ایک رکاوٹ تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے یہ مبارک رات ضائع گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور محض منیٰ میں قیام کی برکت سے اپنے کرم سے نوازے۔

۱۶ اپریل / ۹ ذی الحجہ۔ آج یوم عرفہ ہے۔ عرفہ اصل حج ہے۔ یہاں کا قیام چاہے وہ تھوڑے ہی سے وقت کے لیے کیوں نہ ہو ضروری ہے۔ اگر یہاں بالکل قیام نہ کیا جا سکے تو حج ہی نہ ہوگا۔ صبح ہی سے منیٰ سے عرفہ روانگی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ کسی قدر تاخیر سے سوا نو بجے روانہ ہو سکے۔ ٹریفک کی وجہ سے دو گھنٹے میں میدان عرفہ پہنچے لیکن برادرم ارشد صاحب اور ڈرائیور دونوں ہی راستہ بھول گئے۔ بالآخر ایک بجے کے قریب سخت گرمی میں ہم لوگ خیمے میں پہنچے۔ عرفات میں امام کا خطبہ نہ سن سکے۔ نماز ظہر اور عصر ایک ساتھ اور قصر ادا کی یہی مسنون ہے۔ نماز کے بعد تلاوت اور دعا میں لگے رہے۔ بیس لاکھ کا مجمع اللہ تعالیٰ کے دربار میں دعاؤں میں مصروف ہے کہیں کہیں اجتماعی دعائیں بھی ہو رہی تھیں۔ بعض اوقات لوگ دعاؤں کی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شخص پڑھتا جاتا ہے اور دوسرے سن کر آمین کہتے رہتے ہیں۔ ایسے مواقع پر دیکھنے میں یہ آیا کہ کچھ لوگ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ الگ سے اپنی دعاؤں میں لگ جاتے ہیں کچھ لوگ بے دلی سے ہاتھ اٹھائے رہتے ہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں فطری طور پر اس تاثر سے خالی معلوم ہو رہی تھیں جو انفرادی دعاؤں میں پایا جاتا ہے۔ بہت سے اللہ کے بندے

نہایت عجز و انکسار کے ساتھ خدا کے دربار میں ہاتھ پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے کرم سے توقع ہے کہ ہم جیسے گنہ گاروں کی دعاؤں کو بھی شرفِ قبولیت حاصل ہوگا۔

دعا اپنے دین و ایمان کے لیے کی۔ پورے سفر میں کوئی خاص وقت ایسا نہیں گزرا جس میں اپنے مرحوم والدین کے لیے دعا نہ کی ہو۔ ان ہی کے لطف و محبت اور ایثار و قربانی کے نتیجے میں علم دین کی توفیق اور ٹوٹی پھوٹی خدمت دین کی سعادت ملی۔ افسوس ہے کہ جب تک وہ حیات رہے ان کا حق ادا نہ ہوا اور ان کی خدمت نہ کی جا سکی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کوتاہی کی تلافی کے لیے فرمایا: "والدین کے انتقال کے بعد ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کی جاتی رہے۔ اپنے بچوں کے لیے دعا کی۔ ان سب کے لیے دعا کی جنھوں نے محض حسن ظن کی بنا پر دعا کی درخواست کی تھی۔ اپنے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں اور زندگی جس طرح گزری اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو شدید احساس ہوتا ہے کہ بڑا حصہ غفلت کی نذر ہو گیا۔ دعا ہے کہ جو حصہ رہ گیا ہے اس میں اس کی تلافی کی توفیق دے۔ اللہ کا کرم ہے کہ شروع ہی سے دلچسپی دین کے مطالعہ سے رہی اور دینی مضامین لکھنے کی توفیق ملی۔ اس جوش میں بہت سے موضوعات چھیڑ رکھے ہیں۔ اپنی سست رفتاری کی وجہ سے ان کی تکمیل بظاہر بڑا وقت چاہتی ہے۔ دعا ہے اور یہی دعا عرفات میں، منیٰ میں، مزدلفہ میں اور خدا کے گھر میں بیٹھ کر کی کہ میرے اوقات میں برکت دے اور نامکمل کاموں کی تکمیل کی قوت و صلاحیت عطا فرمائے۔ قلم اور زبان کو بے راہ روی اور لغزشوں سے بچائے رکھے۔ جب تک جسم و جان کا رشتہ باقی ہے زندگی اس کے دین کی راہ میں صرف ہو۔ وہ دن نہ آنے پائے جب دنیا مقصود بن جائے اور اس کے لیے زبان و قلم حرکت کرنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ اہلیہ کو مجھ سے زیادہ توجہ اور یکسوئی حاصل ہے۔ وہ درد و سوز کے ساتھ دعاؤں میں لگی رہتی ہیں۔ میں نے کہا دعا میرے لیے بھی کرتی ہو یا نہیں؟ کہا کرتی ہوں۔ میں نے کہا کیا کرتی ہو؟ کہا جو دعا کرنی ہے وہ کرتی ہوں یہ نہ پوچھئے کہ کیا کرتی ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ بات پوچھنے کی ہے بھی نہیں۔ عرفات میں کیمپ کے لوگوں کی خواہش پر آدھا گھنٹہ خطاب رہا۔ اس میں حج کی اہمیت، معنویت اور یوم عرفہ کی فضیلت پر اظہارِ خیال کیا۔

مغرب سے پہلے ہی مزدلفہ روانگی کی تیاری شروع ہوگئی۔ ۶½ بجے ہم لوگ بس میں سوار ہوئے لیکن ٹریفک کی وجہ سے راستہ جام تھا۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے کا راستہ تقریباً تین گھنٹے میں طے ہوا۔ ہم لوگ پونے دس بجے مزدلفہ پہنچے۔ مغرب اور عشاء کی نماز ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ پڑھی۔ مزدلفہ میں دونوں نمازیں جمع کی جاتی ہیں اور قصر پڑھی جاتی ہیں۔ حسبِ توفیق عبادت اور دعا میں لگے رہے۔

۱۷ اپریل / ۱۰ ذی الحجہ۔ نماز فجر کے فوراً بعد پھر منیٰ کے لیے روانگی شروع ہوگئی۔ جلد ہی منیٰ پہنچ گئے۔ ہمارا خیمہ جمرات سے قریب ہے۔ اس کے باوجود سڑک سے جمرات تک پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ دو سو سے کم نہیں ہوں گی۔ پھر بھی ہمت کی۔ کیمپ کے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ جمرات پہنچے اور رمی کا فرض ادا کیا۔ اہلیہ کی طرف سے بھی رمی کی۔ واپسی پر تکان کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد حلق کرایا۔ قربانی کا نظم ارشد سراج الدین صاحب نے کیا۔ نمازیں خیمہ ہی میں ادا ہوتی رہیں۔

۱۸ اپریل ۱۱ ذی الحجہ جمعہ کا دن ہے۔ منیٰ سے لوگ جوق در جوق نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے حرم جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ دس لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا۔ میرا بھی بہت جی چاہ رہا تھا کہ نماز جمعہ حرم میں ادا ہو۔ لیکن ٹریفک کی وجہ سے اور مناسب سواری کے نہ ملنے کی وجہ سے یہ خواہش نہ پوری ہوسکی۔ البتہ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایک دوست کے ساتھ میں نے اور اہلیہ نے تینوں جمرات پر بڑے اطمینان کے ساتھ اور قریب سے رمی کی اہلیہ کی یہ خواہش بھی اللہ نے پوری کردی۔ مسجد حرام سے لوگ واپس نہیں ہوئے تھے اس لیے اژدحام کم تھا۔

۱۹ اپریل ۱۲ ذی الحجہ۔ آج نماز فجر کے فوراً بعد ہم دونوں افاضہ کے لیے حرم پہنچے ہجوم کے باوجود طواف کی جگہ مل گئی۔ سعی میں بھی کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مسجد حرام میں تھوڑی دیر بیٹھے۔ خدا کے اس گھر کو دیکھتے رہے۔ کیا شان ہے اس گھر کی۔ اس کے بیان کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔

مطاف ہی کے اندر خاص طور پر مقام ابراہیم کے پاس طواف کی سنتیں اور نوافل پڑھنے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے طواف میں بعض اوقات سخت زحمت پیش آتی ہے لوگوں کو زحمت سے بچانے کے ارادہ سے اگر سنن و نوافل مطاف سے ہٹ کر

حرم میں کسی بھی جگہ ادا کر لیے جائیں تو انشاء اللہ ثواب میں کمی نہ ہوگی۔ مطاف اتنا وسیع ہے کہ یہ رکاوٹ نہ ہو تو ہزاروں افراد بیک وقت آسانی سے طواف کر سکتے ہیں۔

آج جمرات پر بے پناہ ہجوم تھا۔ جلد واپسی کے ارادے سے لوگ زوال سے پہلے ہی جمرات کے قریب جمع ہونے لگے۔ تاکہ جیسے ہی زوال کا وقت ہو، رمی کر سکیں۔ میں نے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ ہمت کی۔ مجمع کی وجہ سے ایک جگہ سخت زحمت ہوئی۔ لیکن جمرات تک پہنچا اور اپنی طرف سے اور اہلیہ کی طرف سے رمی کی۔ آج کی رمی بلاشبہ تھکا دینے والی تھی۔ اس طرح مناسک حج اب پورے ہو چکے۔ چار بجے واپسی ہوئی شارع منصور میں چند گھنٹے قیام کے بعد ہم لوگ شب میں گیارہ بجے ڈاکٹر محمد آصف صاحب کے ہاں پہنچے۔

ڈاکٹر محمد آصف علی صاحب اور ڈاکٹر رفیعہ صاحبہ نے اس سفر میں دس گیارہ روز تک اس قدر خلوص اور محبت سے رکھا اور میزبانی کی کہ دل سے دعائیں نکلتیں۔ حالانکہ ان کے بعض اعزا بھی حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کے دو ایک دوست بھی اچانک پہنچ گئے۔ سب کے لیے انھوں نے جگہ نکالی۔ اپنی مصروفیت کے باوجود جس طرح مہمانوں کی ضروریات اور ان کی آسائش کا یہ دونوں خیال کرتے تھے۔ وہ قابل رشک تھا۔

۲۳ اپریل کی شام سے ۲۸ اپریل کی شام تک جدہ میں برادرم جلیل اصغر صاحب کے یہاں قیام رہا۔

جلیل اصغر صاحب سے علی گڑھ ہی سے ایک طرح کی بے تکلفی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا گھر اپنا گھر محسوس ہوا۔ ان کی اہلیہ اور بچوں نے ہم لوگوں کی آسائش کا بہت خیال رکھا۔ اس مدت میں جدہ کے بہت سے دوستوں سے برادرم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب۔ جناب سید یوسف ہاشمی صاحب، جناب عبدالقادر صاحب، جناب عبدالعلیم خاں فلکی صاحب۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب، سعید شبیبی صاحب وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں اور ازراہِ محبت دعوتوں کا طویل سلسلہ رہا۔ بعض اوقات خاصے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ ان کے درمیان قرآن کا درس دینے، یا کسی دینی موضوع پر اظہار خیال کا موقع بھی ملتا رہا۔ اس طرح یہ ملاقاتیں بحمداللہ دینی ملاقاتیں رہیں۔ ۲۵ اپریل کو ایک ہوٹل میں عید ملن کا پروگرام تھا۔ کافی ہندوستانی رفقاء اور احباب جمع تھے۔ اس وقت دوستوں کو ان کی

دینی ذمہ داریاں یاد دلائی گئیں۔

۲۵ر اپریل کو سعودی گزٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر عرفان اقبال خاں صاحب انٹرویو کے لیے پہنچ گئے۔ وقت کی کمی کے باعث انٹرویو نامکمل رہا تو وہ دوبارہ ۲۷ر اپریل کو انھوں نے زحمت کی۔ انٹرویو کا تعلق خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے مسائل سے تھا۔ ۵ر مئی کو یہ انٹرویو سعودی گزٹ میں شائع ہوا بعد میں یہ ہفت روزہ ریڈینس دہلی میں بھی چھپا۔ اسی دوران میں عطاء اللہ صاحب اور مولوی محمد صدیق عمری مدنی کے ساتھ مکتبہ المامون جانا ہوا۔ یہاں عربی کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے۔ بعض ان کتابوں کے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کا اب تک صرف نام سن رکھا تھا۔ بعض کتابوں کی قیمتیں بھی نوٹ کیں۔

۲۸ر مئی/۲۱ر ذی الحجہ کو ہم دونوں جلیل اصغر صاحب کے ساتھ دوبارہ مکہ مکرمہ پہنچے۔ اب کی بار زیادہ تر قیام برادرم محمد اسماعیل صاحب، شیخ حیدر صاحب اور تمیز الدین صاحب کے یہاں رہا۔ یہ قیام ایک ہفتے کا تھا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ طواف کی سعادت حاصل ہوئی۔ دو ایک مرتبہ تکان کا احساس ہوا تو اہلیہ نے ہمت دلائی کہ اس مبارک موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تکان ہو تو برداشت کی جائے۔ ایک مرتبہ مسجد تنعیم سے احرام باندھا اور مزید ایک عمرہ کیا۔

ایک روز ارشد سراج الدین صاحب کے ساتھ جامعہ ام القریٰ جانا ہوا۔ بعض دوستوں سے ملاقات رہی۔ ڈاکٹر طلعت سلطان صاحب کی تعلیمات پر بڑی اچھی نظر ہے۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے اپنی بعض انگریزی مطبوعات سے بھی نوازا۔

جامعہ کی لائبریری میں بھی تھوڑی دیر کے لیے جانا ہوا۔ جناب اکرم سبزواری صاحب سے ملاقات رہی۔ اس عرصہ میں کئی روز مکہ مکرمہ کے بعض مکتبوں میں جانا ہوا۔ جناب ارشد سراج الدین صاحب کی معیت میں بعض ضروری کتابیں خریدیں۔

ہمارا پاسپورٹ حسب ضابطہ معلم کے پاس تھا۔ جناب تمیز الدین صاحب کی کوشش سے اور ان کے ایک عرب دوست کی ضمانت پر واپس ملا۔ اس طرح اس سلسلہ کی پریشانیوں سے اللہ نے محفوظ رکھا۔ ایک ہفتے کے قیام کے بعد ۶ر مئی ۱۹۹۵ء ۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ مکہ مکرمہ سے روانگی کا پروگرام ہے۔ ظہر کی نماز حرم میں پڑھی۔ طواف وداع

کیا۔ بار بار خدا کے گھر کو دیکھا۔ ان پروانوں کو دیکھا جو اس کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ یہ احساس دل و دماغ پر چھا گیا کہ حج جیسی مقدس عبادت کا حق نہ ادا ہوا۔ جس طرح حج ہونا چاہیے، نہ ہو سکا۔ اس مقدس شہر کا صحیح معنی میں احترام بھی باقی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے اور بار بار اس گھر کی زیارت کی سعادت نصیب فرمائے۔

جناب تمیز الدین صاحب کے ساتھ بعد مغرب جدہ روانہ ہوئے اور عشاء کے وقت جدہ پہنچے۔ قیام حسب سابق جلیل اصغر صاحب کے ہاں رہا۔ یہاں پہنچتے ہی دوستوں سے ملاقاتوں اور ضیافتوں کا سلسلہ خاص طور پر بعد عشاء شروع ہو گیا۔ ایک دن خواتین بھی جمع ہوئیں۔ دیر تک ان کے سامنے دین کے تقاضے واضح کیے جاتے رہے۔

اس عرصے میں جناب لئیق اللہ صاحب اور محمد عاشق صاحب ریڈیو انٹرویو کے لیے آ گئے۔ لئیق اللہ صاحب کا تعلق میرٹھ سے ہے۔ عاشق صاحب رام پور کے رہنے والے ہیں۔ رام پور میرے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا عنفوان شباب وہاں گزرا ہے۔ بڑی قربت محسوس ہوئی۔ ان حضرات نے جو انٹرویو لیا تھا اس کی پہلی قسط ۹ مئی، مطابق ۲ محرم ۱۴۱۸ھ بروز جمعہ چار بجے شام کو اور دوسری قسط دوسرے جمعہ کو اسی وقت نشر ہوئی۔ لئیق اللہ صاحب نے اردو نیوز کے لیے ایک طویل انٹرویو لیا تھا۔ یہ دو قسطوں میں شائع ہوا۔

ایک روز مولوی حبیب اللہ عمری سے بیس پچیس برس بعد ملاقات ہوئی۔ وہ استاذ محترم مولانا ابو البیان حماد صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں بھی انھیں بھائی سمجھتا ہوں۔ وہ جدہ ریڈیو سے متعلق ہیں۔ اپنے گھر لے گئے۔ ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

واپسی

ایک ہفتہ جدہ میں گزرا۔ بڑی اچھی صحبتیں رہیں۔ ریاض کے دوستوں نے بھی چاہا کہ دو ایک دن کے لیے میں ریاض پہنچ جاؤں۔ لیکن چونکہ میں حج ویزا پر تھا اس لیے حرمین اور جدہ کے علاوہ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

جدہ میں پورے ایک ہفتہ قیام کے بعد ۱۳ مئی کو روانگی تھی۔ ۱۲ کی شب میں جناب تمیز الدین صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ ملاقات اور رخصت کرنے آ گئے۔ کچھ دیر رہے۔ ایک بجے شب میں ان کی واپسی ہوئی۔

ہمارا ٹکٹ سعودیہ کا تھا۔ صبح سات بجے فلائٹ تھی۔ اس کے لیے چار بجے جلیل اصغر صاحب کے ساتھ ایرپورٹ پہنچ گئے۔ ضابطہ کی کارروائیوں آسانی کے ساتھ ہوگئیں۔ جہاز کچھ تاخیر سے روانہ ہوا۔ ریاض ایک گھنٹے سے زیادہ رکا۔ ریاض سے جب ہم دہلی ایرپورٹ پر پہنچے تو یہاں شام کے چار بجے تھے۔ بچے علی گڑھ اور دہلی سے ایرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ ساڑھے چھ بجے ڈاکٹر رفعت کے گھر پہنچا۔ دو روز قیام کے بعد علی گڑھ لوٹا۔ اس طرح یہ مبارک سفر ختم ہوا۔ پھر وہی شب و روز شروع ہوگئے جو پہلے سے چلے آرہے تھے۔

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی نے اپنی اردو اور انگریزی مطبوعات کے علاوہ دیگر اہم مکتبوں کی بلند پایہ علمی و دینی کتب کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔ تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ اسلام سے متعلق چند اہم کتب کی فہرست دی جارہی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کتب بھی یہاں سے فراہم کی جاسکتی ہیں۔ منیجر

فی ظلال القرآن	دوم	۱۳۵/-	تدوین حدیث (مولانا مناظر احسن گیلانی) ۱۱۰/-
"	سوم	۱۶۰/-	تاریخ الخلفاء (امام سیوطی) ۷۵/-
"	پارہ عم	۹۰/-	مقدمہ ابن خلدون ۲ جلدیں ۱۵۰/-
تفہیم القرآن مکمل ۶ جلدیں		۷۰۰/-	سیرت النبی (ابن ہشام) ۲ جلدیں ۲۲۵/-
تلخیص تفہیم القرآن		۱۷۵/-	رحمۃ للعالمین ۱۴۰/-
ترجمۂ قرآن (مختصر حواشی)		۱۲۵/-	سیرت سرور عالم مولانا مودودیؒ اول دوم ۱۹۵/-
تفسیر ابن کثیر مکمل		۵۲۵/-	الفاروق ۳۰/-
بخاری شریف مکمل (مترجم)		۵۸۵/-	حیات ابوحنیفہ (ابوزہرہ مصری) ۸۵/-
مسلم شریف	"	۵۰۰/-	رسول رحمت (ابوالکلام آزاد) ۱۲۵/-
تفسیر ماجدی اول		۳۰۰/-	انبیاء کرام " ۴۰/-
ابوداؤد شریف ۳ جلدیں		۳۴۰/-	محمد رسول اللہ (توفیق الحکیم) ۵۰/-
تذکرہ علماء بہار		۱۵۰/	تاریخ افکار و علوم اسلامی اول دوم ۷۰/-
سنن نسائی		۳۲۵/-	سیرت النبی (علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی) مکمل ۶۰۰/-

پان والے کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

تحقیق وتنقید

تفسیر نسفی
ایک تحقیقی مطالعہ
(۲)

پروفیسر کبیر احمد جائسی

درج بالا شکوک وشبہات کے باوجود اس تفسیر کی اہمیت اپنی جگہ اس لیے مُسلّم ہے کہ اس کے غائر مطالعے سے مفسر کے عہد حیات کی فارسی زبان پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے ڈاکٹر عزیز اللہ جوینی نے بلاشبہہ اس پہلو سے بڑی ہی دقتِ نظری کے ساتھ زیر نظر تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنا حاصل مطالعہ جلد اوّل کے مقدمہ میں پیش کر دیا ہے چونکہ یہ مطالعہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لیے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں اور مثال کے طور پر صرف چند اُن الفاظ کو نقل کر دیتے ہیں جو اس مفسر نے اپنی تفسیر میں استعمال کیے ہیں مگر اب یہ الفاظ متروک ہو چکے ہیں: آختن = باہر کھینچنا، نکالنا آسفدہ = اَدھ جلی لکڑی۔ آگفت = تکلیف، پریشانی۔ آماشتن = گننا، حساب لگانا، مجازاً اہمیت دینا۔ اَندخیدن = پناہ میں دینا۔ بجہ = پیشانی کے بال۔ خشودن = رحم کرنا۔ چوب خوارج = دیمک، خویدر = چنگاری۔ درویگی کردن = منافقت کرنا، جھوٹ بولنا۔ سَفَدُ = چھت۔ کنانہ = قدیمی، کہنہ۔ نخجیر = حیوانِ درندہ وحشی۔ ہبش = ہوش۔

ہم نے طول کلام سے بچنے کے لیے بہت سے الفاظ کو نقل نہیں کیا ہے۔ زیر نظر تفسیر کے متن کا مطالعہ پیش کرنے سے پہلے یہ جتلا دینا ضروری ہے کہ مفسر نے ترجمہ وتفسیر کو اس طرح باہم دگر خلط ملط کر دیا ہے کہ بعض اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ترجمہ کہاں ختم ہوا اور تفسیر کہاں سے شروع ہو گئی۔

ہم سورۂ بقرہ کی ایسی آیتوں کے مطالعہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں جن کی

توجیہ، تاویل وتشریح کے لیے قدیم مفسروں نے ہی نہیں بلکہ جدید اور جدید ترین مفسروں نے بھی موجودہ توریت کی بیان کردہ روایات کا سہارا لیا ہے۔ ان آیات کی جو ترجمانی زیر نظر تفسیر میں کی گئی ہے وہ درج ذیل ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۴۶)

"نیافتہ (ای) خبر گروہی را از بنی اسرائیل کہ بود ند از بعد موسیٰ، چون گفتند مر پیغامبر خویش را اشموئیل کہ مارا ملکی برپای کن تا باوی بہ حرب رویم در راہ رضای مولیٰ۔ گفت چنان ہست کہ اگر قتال بر شما فریضہ شود نرویت، واز گفتہ پشیمان شویت، گفتند: کی بود کہ ما ایشان حرب نکنیم وایشان مارا از خانہ ہای ما بیرون کردہ، وفرزندان مارا بردہ (بردہ) چون قتال بر ایشان فریضہ شد بہ فرمان، روی بگردانیدند وخلاف کردند مگر اندکی از ایشان، وخدای تعالیٰ داناست بہ عقوبت ستمکاران۔ وابن حرب ایشان را با جالوت می بایست کرد، ووی ملکی بود با قوت وعدت؛ سیصد رطل آہن خود سری او بود، وہشصد ہزار سوار مبارز لشکر او بود۔ آمدہ بود وبا بنی اسرائیل حرب کرد (ہ)، و سران را کشتہ، واموال واولاد را بہ غارت بردہ، وایشان را از خان ومان ایشان بیرون کردہ"

(کیا تم کو حضرت موسیٰ کے بعد کے بنی اسرائیل کے اس گروہ کے بارے میں خبر نہیں ملی ہے جب کہ انھوں نے اپنے پیغمبر اشموئیل سے کہا کہ ہم پر کوئی فرمانروا مقرر کیجئے تاکہ ہم اُس کے ہمراہ (مراد سربراہی میں) رضائے الٰہی کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے جائیں۔ انھوں (اشموئیل) نے فرمایا کہ اگر قتال تم پر فرض ہو جائے گا تو تم لوگ نہ جاؤ گے اور اپنی کہی ہوئی بات پر شرمندہ ہوگے، اُس گروہ نے کہا، کب ہو سکتا ہے کہ ہم اُن سے جنگ نہ کریں، اُن لوگوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکال

دیا ہے اور اولادوں کو غلام بنالے گئے ہیں۔ جب حکم الٰہی سے قتال اُن پر فرض ہوگیا تو اُن لوگوں میں سے ایک چھوٹی سی تعداد کو چھوڑ کر (بقیہ) لوگ (فرمانِ الٰہی) سے منحرف ہوگئے اور اُس کے خلاف کیا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو سزا دینا خوب جانتا ہے ان لوگوں کو یہ جنگ جالوت سے کرنی تھی۔ وہ (جالوت) ایک طاقتور اور پرجمعیت بادشاہ تھا۔ اُس کے سر کا خود تین سو رطل لوہے کا تھا اور اُس کا لشکر آٹھ سو ہزار جنگی سواروں پر مشتمل تھا۔ وہ آیا تھا اُس نے بنی اسرائیل سے جنگ کی، اُن کے سرداروں کو قتل کیا اور اُن کے مال و اولاد کو غارت کیا اور اُن لوگوں کو اُن کی رہائش گاہوں سے نکال باہر کیا۔)

درج بالا عبارت میں "اللہ تعالیٰ ظالموں کو سزا دینا خوب جانتا ہے[1]" تک کلام پاک کی آیت کے فارسی ترجمے کا ترجمہ ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کلام پاک میں صرف لفظ نبی آیا ہے اشموئیل کا نام مفسر نے اپنی طرف سے لکھا ہے۔ اِس کے بعد کی عبارت کو تفسیر سمجھنا چاہیے۔ جہاں تک اشموئیل (سموئیل) نبی کے ذکر کا سوال ہے اس سلسلے میں ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی منفرد نہیں ہیں۔ قدیم و جدید بہت سے مفسروں نے درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں ان کا نام لکھا ہے۔ انیسویں صدی کے سرسید احمد خاں اور بیسویں صدی کے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ[2] نے تو اس سلسلے میں اتنی مکمل اور طویل گفتگو کی ہے کہ اُن کی تحریروں کے سامنے ابوحفص نجم الدین عمر کی تفسیر عشر عشیر کا بھی درجہ نہیں رکھتی۔ اسی سلسلۂ سخن میں اگر اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں اور مولانا مودودیؒ نے بائبل سے استفادہ کرتے ہوئے جس طرح کلام پاک کی آیات

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے "اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں"۔ سرسید احمد خاں کا ترجمہ ہے "اور اللہ جانتا ہے ظالموں کو" مولانا مودودی کے الفاظ یہ ہیں "اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے"۔ سرسید احمد خاں کا ترجمہ لفظی ہے بقیہ دونوں ترجموں میں قرآن کے الفاظ کی روح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، سرسید احمد خاں، ج ۱ عکسی طباعت ۱۹۹۵ کتابخانہ خدا بخش پٹنہ ص ۲۱۸ ببعد اور تفہیم القرآن ج ۱، مکتبہ جماعت اسلامی رام پور، جنوری ۱۹۵۸ ص ۱۸۷ ببعد۔

کی توجیہ وتاویل وتفسیر کی ہے اگر اس کا علمی انداز سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت سے نادر اور چونکا دینے والے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی حضرات کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

(البقرہ: ۲۴۷)

"وگفت مرایشان راپیغامبر ایشان کہ خدای طالوت را ملکی شما کرد، وکار حرب شمارا بہ وی مفوض ومہیا کرد، گفتند: کہ، چگونہ بود وی را بر ما ملکی ووی از خاندان مملکت نی، وما سزاوار تریم ازوی بہ ملک کہ از سبط یہودا ایم وملک بنی اسرائیل را جز بدین سبط نسبت نی، وطالوت مرد درویش ووی را مال وغنیمت نی، گفت: خدای تعالیٰ بہ ملک وی را بر شما برگزید، ووی را بہ زیادتی علم حرب وقوت مخصوص گردانید؛ وخدای تعالیٰ مُلک آن را دہد، کہ خواہد، وخدای تعالیٰ جواد وغنی است ودانندہ است کہ سزوار مُلک کیست۔"

(اور اُن کے پیغمبر نے اُن سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے اور تمہاری جنگ کے کام کے لیے اس کو تیار کیا اور سونپا ہے۔ اُن لوگوں نے کہا وہ ہم پر بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے (جب کہ) وہ شاہی خاندان سے نہیں ہے اور ہم ملک (کی سربراہی) کے لیے اُس سے زیادہ اہل تر ہیں کیونکہ ہم یہودا کے خاندان سے ہیں اور بنی اسرائیل کی بادشاہت کو بجز اُس خاندان کے نسبت نہیں (یعنی اُس خاندان ہی کا کوئی فرد بنی اسرائیل کے ملک کا بادشاہ ہو سکتا ہے)۔ طالوت درویش منش ہے اس کے پاس مال وغنیمت بھی نہیں ہے۔ انھوں (پیغمبر) نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس کو تم پر بادشاہت کے لیے چنا ہے اور اُس کو جنگی علم کی زیادتی اور مخصوص قوت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک اُسی کو دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمانے والا اور خود مختار[1] ہے۔ اور وہ جانتا

[1] غنی کے معنی خود مختار کے بھی ہیں۔

ہے کہ ملک (کی سربراہی) کا اہل کون ہے)

ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی کی درج بالا فارسی عبارت کلام پاک کی آیت کے لفظی ترجمے پر مشتمل ہے صرف دو جگہوں پر انھوں نے لفظی انحراف کرتے ہوئے اپنی بات کہی ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے طالوت کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ان کے سامنے وہ ساری روایتیں رہی ہوں گی جن کی مدد سے بیسویں صدی عیسوی کے مفسروں نے طالوت کے بارے میں اطلاعات فراہم کی ہیں۔ طول کلام سے بچنے کے لیے یہاں صرف ایک مثال کی طرف سرسری سا اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے طالوت کے بارے میں بائبل سے جو معلومات اخذ کی ہیں وہ انہی کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہیں۔

"بائبل میں اس کا نام ساؤل لکھا ہے یہ قبیلہ بن بمین کا ایک تیس سالہ نوجوان تھا" بنی اسرائیل میں اس سے خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے" اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہونچا تو اللہ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے چنانچہ سموئیل نبی اسے اپنے گھر لائے تیل کی کپی لے کر اس کے سر پر انڈیلی اور اسے چوما اور کہا کہ "خدا نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو" اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۱۔ سموئیل باب ۹-۱۰)[1]

یہاں پر اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ایک قدیم فارسی تفسیر کے گم نام مفسر نے بنی اسرائیل کے نبی کا نام سموئیل نہیں اسمٰعیل بن ہلقانہ تحریر کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد کی دوسری آیت میں قتادہ کے حوالے سے انہی کو یوشع بن نون تحریر

---

[1] تفہیم القرآن، حوالہ سابق جلد اول ص ۱۸۷، ۱۸۸۔ سرسید احمد خاں نے اپنی تفسیر میں سموئیل نبی کی کتاب پر جو بحث کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، ج ۱ (خدا بخش لائبریری ایڈیشن) تفسیر سورۂ بقرہ ص ۲۲۲۔

کیا ہے[1]

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (البقرہ: ۲۴۷)

...."وگفت مر ایشان را پیامبر ایشان کہ نشان ملک وی آن است کہ رسد بہ شما تابوت، کہ در رسیدن وی است دلہای شما را قرار و ثبوت، وگویند: سکینہ شخصی بود کہ وی را چشم و صورت بود در جسم وی (کہ) چشم ہای دشمنان خیرہ شدی، و از شعاع آن وقت خصمان تیرہ شدی، و از بانگ وی دلہای ایشان بترسیدی و اسپان ایشان برمیدی. و نیز در وی باقیی از آنچہ ماند موسیٰ نبی، و ہارون نبی، و آن عصای موسیٰ کلیم بود، و عمامۂ ہارون کریم بود، و پارہ ای ترنگبین، و قطعہ ای از الواح زمردین؛ می آرندش فرشتگان، اندرین آیتی است شما را اگر ہیبت تصدیق کنندگان"[1]

(اُن کے پیغمبر نے ان سے کہا، کہ اُس کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آئے گا جس کے آنے سے تمہارے دلوں کو قرار اور استحکام (ہوگا) اور لوگ یعنی مفسرین کہتے ہیں کہ سکینہ آنکھیں اور جسم رکھنے والا ایک شخص ہے اُس کے وجود سے دشمنوں کی نگاہیں چکاچوند[2] اور اس کی آنکھوں کی شعاعوں سے مخالفوں کی زندگی تاریک اور آواز سے اُن کے دل کانپتے ہیں اور ان کے گھوڑے بھاگ جاتے ہیں اور اُس میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے والے موسیٰ اور نبی ہارون کی باقیات بھی ہیں اور وہ (باقیات) ہیں کلام کرنے والے موسیٰ کا عصا اور کرم کرنے والے ہارون کا عمامہ، اور مَن[3] کا ایک ٹکڑا، اور زمرد کی تختی کا ایک حصہ (قطعہ)

---

[1] بخشی از تفسیر کہن، بنیاد فرہنگ ایران تہران، ۱۳۵۱ء ش ص ۱۰۷، ۱۰۸ [2] یہ وقت کا مجازی ترجمہ ہے۔
[3] مَن، وہ خوراک جو اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو غیب سے عطا کرتا تھا۔

جس کو فرشتے لاتے ہیں اگر تم لوگ با ایمان ہو تو تمہارے لیے یہ علامتیں ہیں۔ (مطلب یہ ہے کہ یہی تابوت سکینہ ہوگا)

جس آیت کی تشریح میں یہ بے سروپا افسانہ اوپر درج ہوا ہے اس کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی نے یوں کیا ہے:

"اور ان سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ اُن کے (من جانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجاوے گا جس میں تسکین اور برکت کی چیز ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) اور (حضرت) ہارون (علیہ السلام) کی اولاد چھوڑ گئی ہے۔ اُس (صندوق) کو فرشتے لے آویں گے۔ اس میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔"

اس ترجمے سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ زیر نظر مفسر نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا کلام پاک سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں[1] ہے۔ مزید براں ڈاکٹر عزیز اللہ جوینی نے جو متن مرتب کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی سقم سے خالی نہیں ہے۔ متن میں پہلے تو کلام پاک کے ارشاد کے عین مطابق صندوق کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے پھر "سکینہ" کو آنکھیں اور جسم رکھنے والا انسان بتایا گیا ہے بعد ازاں اسی تسلسل میں اُس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی باقیات کے ہونے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ متبرک باقیات کسی صندوق یا اُس جیسی چیز میں ہو سکتی ہیں آنکھیں اور جسم رکھنے والے شخص کے اندر نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخطوط کے کاتب سے بیچ کا کوئی جملہ چھوٹ گیا ہے جس کی طرف ترتیب متن کے وقت ڈاکٹر عزیز اللہ جوینی کی نظر نہیں جا سکی ایک نکتہ اور درج بالا آیت میں تحمله الملئکة کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں

---

[1] اس "وصف" میں ابو حفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی منفرد نہیں ہیں اگر کسی کو "بوالعجبیوں" کا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو اُس کو مولانا نظام الدین اسیر ادروی کی کتاب "تفسیروں میں اسرائیلی روایات" مطبوعہ دیوبند کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ مزید برآں طالوت اور جالوت کے سلسلے میں سر سید احمد خاں نے سموئیل کی کتاب پر جو کچھ لکھا ہے اُس کو بغور پڑھنا چاہیے۔

تقریباً تمام مفسروں نے اس کا ترجمہ "فرشتے لے آئیں گے" کیا ہے یہی ترجمہ سرسید احمد خاں نے بھی کیا ہے مگر اُس کی تفسیر میں انھوں نے جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ جمہور علماء کی جو رائے ہے اس کی نمائندگی مولانا عبدالماجد دریابادی کے درج ذیل الفاظ کرتے ہیں:

"تحملہ الملئکۃ" تکوینی تصرفات جتنے بھی ہوتے رہتے ہیں سب فرشتوں ہی کے ذریعے انجام پاتے رہتے ہیں چنانچہ بیلوں کا رخ خاص اسرائیلی علاقے کی جانب کر دینا بھی فرشتوں ہی کا کام تھا اور یہی غیبی نشان تھا طالوت کی تائید میں[1]"

سرسید احمد خاں جمہور علماء کی رائے سے متفق نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ:

"تحملہ الملئکۃ" جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونے کے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیج دینا چاہا تو اس کو بیلوں کی جوڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھڑوا دیا تھا یہ قصہ شموئیل (سرسید احمد نے ہر جگہ یہ نام "ش" ہی سے لکھا ہے) کی کتاب میں ہے۔ ہمارے علمائے مفسرین نے کہہ دیا کہ اُن بیلوں کو جن پر کوئی ہانکنے والا نہ تھا فرشتے ہنکا لائے تھے اور یہی معنی تحملہ الملئکۃ کے قرار دے دیئے بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تحملہ کے لفظ پر چسپاں نہیں ہوتے تو انھوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اوپر فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لا کر دے دیا۔ یہ سب غلط قیاسات ہیں آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنے کی بڑی خواہش تھی شموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اُس کی بادشاہت میں تابوت سکینہ آجاوے گا اور جو کہ (چونکہ)

---

[1] تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لمٹڈ قرآن منزل لاہور (گذارش ناشرین کی عبارت جہاں ختم ہوتی ہے وہاں ۱۴ اگست ۱۹۵۲ درج ہے۔ قیاس ہے کہ یہی سنہ طباعت ہوگا)

اس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا اِس لیے انھوں نے کہا کہ اس کو فرشتے اٹھالاویں گے جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے۔"

ہمارے خیال میں سرسید احمد خاں کا جمہور علماء سے اختلاف کرنے کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ اِس بات کے سرے سے قائل ہی نہیں معلوم ہوتے کہ تکوینی کام فرشتوں کے ذریعہ انجام دلوائے جاتے ہیں۔ اپنے اسی "عقیدے" کی وجہ سے وہ بہت سے قرآنی الفاظ کے لغوی معنی نہیں بلکہ مجازی معنی مراد لیتے ہیں سرسید احمد خاں ہوں یا وہ مفسرین جن سے سرسید احمد خاں نے اختلاف کیا ہے اگر اپنی ساری تگ و دو متنِ قرآن کو سمجھنے تک محدود رکھتے تو ہمارے جیسے عامی اس خلجان سے بچے رہ سکتے تھے جو آج درد لادوا بن چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ ۚ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ: ۲۴۹)

"... چون بر ملک طالوت منفق شدند، و طالوت و سپاه با به صحرا آمدند، گفت: خدای تعالی شما را به جوی آزموده خواهد کرد، هر که شکم بر زمین نهد و به دهان از وی آب خورد وی نیست از سپاه من، و هر که از وی آب را چنین نخورد و لیکن آب به کف برگیرد وی است از سپاه من، وی را خواهم بردن. چون رسیدند، و نیک تشنه شده بودند، به روی در افتادند، و به دهان آب خوردند، مگر اندک از ایشان و آن سیصد و سیزده تن بودند (چون درگذشت از وی طالوت و مومنان، خبر یافتند که جالوت آمد با هشصد هزار سوار بحرب شان)؛ گفتند: ما طاقت جالوت و سپاه وی نداریم، و با وی حرب کردن و روی آوردن نیاریم. گفتند آن کس ها که به قیامت بی گمان بودند، و دیدار خدای

را تعالیٰ امید دارند گان بودند: چند گروہ اندک کہ غلبہ کردند گروہ بسیار را بہ نصرت خدای، و مر صابران راست معونت و حفظ خدای"۔

(وہ لوگ جب طالوت کی بادشاہت پر متفق ہو گئے اور طالوت اور سپاہی صحرا میں آئے، اُس (طالوت) نے کہا؛ اللہ تعالیٰ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرے گا جو شخص بھی اپنے پیٹ کو زمین پر رکھے گا (اوندھا لیٹے گا) اور اُس کے پانی کو پئے گا وہ میرے سپاہیوں میں سے نہیں ہے اور ہر وہ شخص جو پانی کو اس طرح نہیں پیے گا بلکہ پانی کو چُلّو میں لے گا وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔ میں اُس کو (اپنے ساتھ) لے جاؤں گا۔ وہ لوگ جب وہاں پہونچے بہت پیاسے ہو چکے تھے اُن میں سے تھوڑے سے نے جو کہ تین سو تیرہ تھے اِس طرح پانی نہیں پیا (بقیہ لوگ) اوندھے گر گئے اور انھوں نے منہ سے (یعنی چوپایوں کی طرح) پانی پیا (جب) اُس (نہر) سے طالوت اور باایمان افراد گذر گئے تو اُن لوگوں (یعنی پانی پینے والوں) کو اطلاع ملی کہ جالوت آٹھ سو ہزار سواروں کے ساتھ اُن سے جنگ کرنے کے لیے آیا ہے[1]۔)

ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس جالوت اور اس کے سپاہیوں کی طاقت نہیں ہے اور ہم اُس سے جنگ کرنے اور مقابل ہونے کی تاب نہیں رکھتے۔ جن لوگوں کو قیامت پر یقین تھا اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی امید رکھتے تھے انھوں نے کہا چند چھوٹے چھوٹے گروہ تائید الٰہی سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آئے ہیں۔ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں اللہ ان کی حفاظت و معاونت کرتا ہے۔"

درج بالا فارسی عبارت نہ تو کلام پاک کی آیت کا لفظی ترجمہ ہے اور نہ ہی شرح وبسط کے ساتھ اُس کی تفسیر۔ مزید برآں کلام پاک میں لوگوں کے چار پایوں کی طرح پانی پینے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی مومنوں اور غیر مومنوں کی کوئی متعین تعداد بتائی گئی ہے۔ زیر نظر مفسر نے یہ سب باتیں نہ جانے کہاں سے اخذ کی ہیں ابو حفص نجم الدین

---

[1] یہ قوس اصل متن کا ہے۔

عمر بن محمد نسفی کی اسی اجمالی تحریر کی تفصیل سید احمد خاں کی تفسیر میں موجود ہے جس کا ذکر اس موقع پر ناگزیر ہے انھوں نے اس آیت میں بیان شدہ واقعات کی شرح کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ شموئیل کی کتاب میں:

"طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمے کا پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ ۱۲۹۹ قبل مسیح میں ہوا تھا اس لیے عیسائی مورخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعے کو طالوت کے لشکر کے واقعے سے ملا دیا ہے۔"[۱]

عیسائی مورخوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سرسید احمد خاں نے کتاب شموئیل کے مضامین میں باہم اختلاف کو عالمانہ دقت نظری کے ساتھ تفصیل سے اجاگر کیا ہے اور خود کتاب شموئیل کی اصالت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ یہ پوری بحث بڑے ہی عالمانہ انداز سے کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ایسے الفاظ کا استعمال نہ ہونے پائے جو بائبل کے ماننے والوں کی دل آزاری کا سبب بنے۔ سرسید احمد خاں کی تحقیق کا ماحصل ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا وہ علٰحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علٰحدہ ہے اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُس زمانے کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا اس واقعے کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انھیں کے مقابلے میں قرآن مجید میں اعلانیہ ایسا بیان نہیں ہو سکتا تھا۔"[۲]

---

[۱] تفسیر القرآن (کتاب خانہ خدا بخش ایڈیشن) ج ۱، تفسیر سورۂ بقرہ ص ۲۲۱

[۲] ایضاً ص ۲۲۶، ۲۲۷

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ: ۲۵۱)

"برشکستند شان بہ نصرت خدای، وبکشت داؤد جالوت را بہ سنگ فلاخن بہ معونت خدای؛ وداد ش خدای تعالیٰ ملک ورسالت، وآموختش صنعت زرہ گری بی آتش وآلت، واگرنہ دفع خدایستی بلا را از بعضی بہ قیام بعض از ایشان، وبران شدستی این جہان، ولیکن خدای تعالیٰ فضل کنندہ است برعالمیان"۔

(اللہ تعالیٰ کی مدد سے انھوں (طالوت کے سپاہیوں) نے اُن (جالوت کے فوجیوں) کو شکست دی اور داؤد (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کی معاونت سے گوپھن کے پتھر سے جالوت کو مار ڈالا، اور اللہ نے ان کو بادشاہت اور پیغمبری عطا فرمائی اور اُن کو بغیر آگ اور آلات کے زرہ بنانی سکھائی، اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی بغاوت سے بعض انسانی بلاؤں کو دفع نہ کرے تو یہ دنیا ویران ہو جائے، لیکن اللہ دنیا والوں پر فضل کرنے والا ہے۔)

یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ "گوپھن کے پتھر" اور "بغیر آگ اور آلات کے زرہ بنانے" کا ذکر قرآن پاک نے مطلقاً نہیں کیا ہے۔ قرآن پاک نے صرف اتنا بتلایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اُن کو بادشاہت اور پیغمبری عطا فرمائی" "مزید برآں" جو جو منظور ہوا اُن کو تعلیم فرمایا" "جو جو منظور ہوا" کی جو بھی تشریح کی جاتی ہے وہ انسانی دماغ کی پیداوار ہے فرمانِ الٰہی کا جزو نہیں۔ "بخشی از تفسیر کہن" کے گم نام مفسر نے جو یقیناً ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی سے متقدم تھے اپنی تفسیر میں اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ جالوت کے قتل کے سلسلے میں واعظوں اور نیم خواندہ مقرروں نے عوام میں جو قصے پھیلا رکھے ہیں اور جن کو جھوم جھوم کر بڑے خشوع وخضوع سے پڑھا اور سنا جاتا ہے اُن کے مخترع آج کے واعظ اور خطیب نہیں ہیں یہ "دولتِ بیدار" تو ایک ہزار سال سے بطور وراثت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ عیسائی مورخوں نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۶ تا ۲۵۱ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان پر اعتراضات کر کے

قرآن پاک کو غلط ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں سرسید احمد خاں غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عیسائی مورخوں کے اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں مگر اس کے باوجود ہندوستان کے متوسط طبقے کا تو کیا ذکر "اعلیٰ طبقے" میں بھی بے سروپا روایات اور بے سند کہانیوں پر یقین رکھنے والوں کا وہی فی صد آج بھی برقرار ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر یا اس سے پہلے کی صدیوں میں تھا۔

سورۂ بقرہ کی درج بالا آیتوں کے ترجمے اور تفسیر کے سلسلے میں ابو حفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی نے جو روش اختیار کی ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ہو گیا ہوگا ہم اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے چند اور آیتوں کی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۖ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

..... "حرام نکردہ است خدای تعالیٰ بحیرہ را و سائبہ و وصیلہ و حام، ولیکن کافران دروغ می گویند بر خدای تعالیٰ کہ وی کردہ است اینہا را بر ما حرام، و بیشترین ایشان بی خرد اند مقلد اند و عام، بحیرہ مادہ شتری بدی کہ پنجم شکم بزادی، و آخری نر بودی، گوش وی بشکافتندی، و وی را رہا کردندی، و بروی دیگر نہ نشستندی بار ننہادندی و شیر وی نخوردندی، و پشم وی نبریدندی، و از ہیچ آب و گیاہ اورا باز نداشتندی، و سایبہ مادہ شتری بودی، کہ خداوندش نذر کردہ بودی، کہ اگر بیماری من بہتر شود، یا غایب من بہ سلامت باز آید، یا مال من بہ من باز رسد، وی را، رہا کنم بہ بیابان، و تعرض نکردی وی را کسی از مردمان، و باز نداشتندی وی را از ہیچ آب و گیاہ و وصیلہ میشی بودی کہ پنجم شکم بزادی، و شکم پنجم نری و مادہ ای بہم آوردی، گفتندی وصلت اخاہا و وی را بدین سبب وصیلہ نام کردندی، و منافع وی بر خویشتن حرام کردندی و حامی شتر گشنی بودی کہ بہ گشن وی دہ بچہ گشن حاصل شدہ بودی، گفتندی حمی ظہرہ و وی را حامی خواندندی؛ و وی را رہا کردہ بر مثال آنہا کہ گفتیم رہا کردندی۔"

(بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ اور حام (حامی) کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا ہے مگر

کفار اللہ پر بہتان باندھتے ہیں کہ اس نے ہم پر ان کو حرام کیا ہے، اور ان کفار میں سے بیشتر لوگ بے عقل ہیں اور سفلے۔ بحیرہ وہ اونٹنی تھی جو پانچ بچے جنتی اور اس کا آخری بچہ نر ہوتا، اس کے کان کو شگاف دیتے اور چھوڑ دیتے، پھر اس پر نہ سواری کرتے نہ بوجھ رکھتے اور نہ اُس کا دودھ پیتے نہ اس کے بالوں کو کاٹتے اور کسی بھی چارہ پانی سے اُس کو نہ روکتے اور سائبہ وہ اونٹنی تھی جس کے لیے اس کا مالک منت مانتا کہ اگر میری بیماری دفع ہو جائے یا مجھ سے بچھڑا سلامتی کے ساتھ واپس آئے، یا میرا مال مجھے واپس مل جائے تو میں اس کو جنگل میں چھوڑ دوں گا" لوگ اُس سے کوئی تعرض نہ کرتے اور کسی پانی اور چارے سے نہ روکتے اور وصیلہ وہ بھیڑ تھی کہ پانچویں بار بچہ جنتی اور پانچویں بار ایک نر اور ایک مادہ کو جنم دیتی (اس کے لیے) لوگ کہتے وَصَلَتْ اَخَاهَا (وہ اپنے بھائی کے پاس پہونچی) اور اسی لیے اس کو وصیلہ کے نام سے موسوم کرتے اور اس سے فائدہ اٹھانا اپنے اوپر حرام قرار دیتے اور حام (حامی) وہ نر اونٹ ہوتا جس کے نطفے سے دس نر بچے پیدا ہوئے ہوتے (اس کے لیے) لوگ کہتے حمی ظہرہ (اپنی پیٹھ کی مدافعت کی) اور اس کو حام کا نام دیتے اور اُس کو اُسی طرح آزاد کر دیتے جس طرح ہم دوسرے جانوروں کے آزاد کرنے کو بتلا چکے ہیں)

درج بالا آیت میں حیوانوں کے جتنے ناموں کا استعمال ہوا ہے نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب اُن سے بخوبی واقف تھے اپنے اجداد کی طرح وہ بھی "نذر" کے طور پر حیوانوں کو آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے اور اپنی ناموں سے اُن کو منسوب کرتے اس لیے اِن الفاظ کی تشریح اور تفہیم کی اُن کو مطلق ضرورت نہ تھی لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا خود عربوں کے لیے بھی یہ الفاظ محتاجِ تشریح بن گئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی جیسے الفاظ کے ایک معنی نہ رہ گئے

لہ اِسٹنگاز (Steingass) نے عام کے ایک معنی The Vulgar بھی لکھے ہیں ہم نے اُسی کے ترجمے کو یہاں ترجیح دی ہے۔ ۲ گشن کسی بھی جانور کے نر کو کہتے ہیں۔

بلکہ مختلف لوگ مختلف طور پر اُن کی تعبیر و تشریح کرتے رہے۔

اوپر کی سطروں میں اِن جانوروں کی جو شناخت بتائی گئی ہے وہ چھٹی صدی ہجری کے ایک غیر عرب (وسط ایشیائی) مفسر کی بیان کردہ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ بعد کے زمانے کے لوگوں نے اِس مفسر سے کس حد تک اختلاف کیا ہے اور کس حد تک اتفاق؟ ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف بیسویں صدی کے تین عالموں کی تحریروں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بحیرہ کے جو معنی لکھے ہیں وہ وہی ہیں جو ابوحفص نسفی نے لکھے ہیں۔ سائبہ کو مولانا مودودی نے اونٹ یا اونٹنی لکھا ہے جب کہ نسفی نے اس کو صرف اونٹنی قرار دیا ہے۔ علاوہ برایں مولانا مودودی نے سائبہ کے لیے تحریر کیا ہے کہ "جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو"، نسفی نے سائبہ کے لیے اِس طرح کی کوئی بات تحریر نہیں کی۔ وصیلہ کو مولانا مودودی نے بکری اور نسفی نے بھیڑ[1] قرار دیا ہے مولانا مودودی نے تحریر کیا ہے "اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اسی کا نام وصیلہ تھا"۔ نسفی کے نزدیک "حام" نر اونٹ تھا جس کے نطفے سے دس نر بچے پیدا ہو چکے ہوتے مگر مولانا مودودی کے نزدیک وہ نر اونٹ "حام" تھا جس کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا اور اُس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا علاوہ ازیں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے "نیز اگر کسی اونٹ کے نطفے سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل[2] جاتی" دس بچوں کی بات تک نسفی اور مولانا مودودی متفق ہیں مگر پوتے کا ذکر اور دادا کا حام ہونا نسفی کے یہاں نہیں ہے۔

---

[1] میش کا لفظ کبھی کبھی بکری کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ غلط بھی ہے اور بہت ہی کم مستعمل بھی اِس لیے ہم نے اس کا ترجمہ بھیڑ ہی کیا ہے۔

[2] تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۵۰۹

بیسویں صدی عیسوی ہی کے مگر مولانا مودودی سے متقدم ایک مشہور عالم دین اور مفسر قرآن مولانا اشرف علی تھانوی نے مذکورہ اسما کے لیے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ نہ تو ابوحفص نسفی کی تحریر کے عین مطابق ہے نہ ہی مولانا مودودی کی تحریر کے۔ مولانا تھانوی کے الفاظ یہ ہیں:

"بحیرہ وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے اسے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا اور سائبہ وہ جانور ہے جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے، اس سے کوئی کام نہ لیتے جیسے اس ملک میں بعض لوگ سانڈ چھوڑتے ہیں اور وصیلہ وہ ناقہ ہے جو پہلی بار مادہ بچہ جنے پھر دوسری بار بھی مادہ بچہ دے درمیان میں نر بچہ نہ پیدا ہو اس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور حامی وہ نر اونٹ ہے جو ایک خاص شمار سے جفتی کر چکا ہو اُس کو بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے۔[1]

مولانا اشرف علی تھانوی سے عمر میں چھوٹے اور مولانا مودودی سے بڑے ایک دوسرے عالم دین و مفسر مولانا شبیر احمد عثمانی نے اِن اصطلاحات کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے۔

"بحیرہ، صائبہ (؟ سائبہ) وصیلہ حامی یہ سب زمانۂ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں۔ مفسرین نے اِن کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے ممکن ہے کہ اِن میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو۔ ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ بحیرہ جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ سائبہ جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈھ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اُسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

---

[1] عکسی قرآن مجید مترجم مطبوعہ کتب خانہ اشاعتِ اسلام چوڑی والان دہلی سنہ ندارد ص ۱۵۱ ہمارے سامنے مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا اختصار ہے۔

حامی نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے حفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے[1]"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے نزول قرآن کے زمانے کے عرب زیر بحث مصطلحات سے بخوبی واقف تھے اس لیے اُن کو کسی تعبیر و تشریح کی ضرورت نہ پڑی تھی لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا لوگوں کے درمیان ان اصطلاحات کے معانی و مفاہیم میں اختلاف ہونے لگا مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی لفظی فرق و اختلاف نہیں ہے بلکہ سنگین ہے۔ ان اصطلاحوں کے لیے عربوں نے جو کچھ لکھا ہو اس سے بحث مقصود نہیں دکھلانا یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے وسط ایشیا کی فارسی زبان میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی کے کیا معنی و مفہوم تھے۔

اسی طرح کی ایک بحث حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اس واقعے کے سلسلے میں بھی ہوتی رہی ہے جس کا ذکر سورۂ انعام کی آیات ۷۶ تا ۷۸ میں ہوا ہے۔ ہم اس سلسلے میں بھی پہلے کلام پاک کی آیت بعد ازاں ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی کی تحریر نقل کرنے کے بعد چند مفسروں کی رایوں کا مقابلہ و موازنہ نسفی کی تحریر سے کریں گے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۔

"چون شب تاریک در آمد و روز را فرو پوشید، ستارہ [ای] بدید؛ گویند مشتری بود، و گویند زہرہ بود، و گویند جزآن بود، و آن بہ حضرت جاعتی ستارہ پرستان بود، و قصد وی باطل کردن اعتقاد ایشان بود۔ گفت! اینست پروردگار من واین بر طریق انکار بود، نہ بر طریق تقریر و اقرار بود، چون فرو رفت آن گفت دوست ندارم فرو رو[ند]گان را، و این تنبیہ بود آنان را، کہ تغییر و زوال، و تحول از حال بہ حال، بر خداوند تعالیٰ دانند محال۔"

[جب کالی رات آگئی اور اُس نے دن کو چھپا لیا۔ انھوں (حضرت ابراہیمؑ)

---

[1] قرآن پاک ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب، تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، مطبوعہ شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلکس مدینہ منورہ ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۹ء) ص ۱۶۵۔ مولانا عثمانی کی اس تحریر سے مولانا تھانوی کا ماخذ بھی صحیح بخاری کی یہی روایت معلوم ہوتی ہے۔

نے ایک ستارے کو دیکھا، لوگ کہتے ہیں کہ وہ (ستارہ) مشتری تھا اور (کچھ) لوگ کہتے ہیں زہرہ تھا اور (دیگر لوگ) کہتے ہیں کہ اِن دونوں کے علاوہ تھا اور حضرت ابراہیم[1] علیہ السّلام ستارہ پرستوں کی ایک جماعت کے درمیان[2] تھے اور اُن کا ارادہ اُس جماعت کے عقیدے کو رد کرنے کا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے تردید و انکار کے طور پر نہ کہ تائید و اقرار کے طور پر فرمایا، یہ ہے میرا رب۔ جب وہ (ستارہ) ڈوب گیا تو انھوں نے فرمایا میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور یہ ان لوگوں کو تنبیہ تھی، کیونکہ وہ (حضرت ابراہیمؑ) اللہ تعالیٰ (کی ذات) میں تبدیلی اور زوال اور ایک حال سے دوسرے حال میں بدل جانے کو ناممکن سمجھتے تھے۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ

"چون دید ماہ را برآیندہ، و بہ نزد وی جماعتی ماہ پرستندہ، گفت! اینست پروردگار من بر وجہ انکار، نہ بر وجہ اثبات این کار؛ چون فرو رفت گفت اگر ثابت ندارد مرا خدای من بر ہدایت، باشم من از اہل ضلالت"۔

[جب چاند کو نکلا ہوا دیکھا، حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آس پاس چاند کی پرستش کرنے والی ایک جماعت تھی) حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے انکار کے طور پر نہ کہ اثبات کے طور پر فرمایا، یہ ہے میرا رب۔ جب وہ ڈوب گیا تو انھوں نے فرمایا، اگر میرا اللہ مجھ کو ہدایت پر قائم نہ رکھے، میں اہلِ ضلالت میں سے ہو جاؤں۔]

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔

---

[1] ہم نے "وہ" کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اسم گرامی لکھا ہے۔

[2] حضرت بہ معنی Presence بھی مستعمل ہے ہم نے اردو زبان کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مفہوم کو لفظ "درمیان" سے ادا کیا ہے۔

"چون دید آفتاب را بر برآینده، وآنجا قوم آفتاب را پرستنده، گفت اینست خدای من، بروجہ رد قول آن انجمن، این کلان تر آمد، ونور وی رخشان تر آمد؛ چون فرو رفت گفت من بیزارم از آنچہ، شما شریک می آریت، وبدان اعتقاد می داریت"
[جب سورج کو نکلا ہوا دیکھا، وہاں پر سورج کو پوجنے والی قوم (تھی) حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اُن لوگوں کے قول کی تردید کے طور پر فرمایا، یہ سب سے بڑا اور نور میں سب سے روشن[1] آیا۔ جب وہ ڈوب گیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم لوگ جن کو شریک کرتے اور جن پر اعتماد رکھتے ہو، میں اُن سب سے بیزار ہوں]

کلام پاک کی جن تین آیتوں کا متن اور اُن کے متعلق تفسیر نسفی کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اُن کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی کے نزدیک اِن آیتوں میں جو مضمون اور جو واقعہ نقل ہوا ہے اُس میں اُن کو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کی تشریح و توجیہ و تاویل کے لیے اُس زمانے کے تمام مروجہ علوم وفنون کی مدد لی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السّلام جس قوم میں پیدا ہوئے تھے اُس کی تاریخ کی چھان بین کی جائے، اس بات پر بحث کی جائے کہ کیا ایک ہی وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ستارے، چاند اور سورج کو دیکھا تھا یا مختلف اوقات میں؟ مزید برآن ہٰذا ربّی کے لغوی معنی لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو وقتی شرک کا الزام عائد ہوتا ہے اُس کو رفع کرنے کے لیے لایعنی صغریٰ وکبریٰ کو ملایا جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اُن کی والدہ معظمہ نے بادشاہ وقت کے ڈر سے ایک غار میں جَنا اور اُس کا منہ پتھر سے ڈھک دیا، ان کی پرورش فرشتے نے کی جس رات درج بالا واقعہ پیش آیا اُس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے آسمان دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب انھوں نے آسمان اور اُس ستارے کو دیکھا تو ہٰذا ربی کہہ دیا۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کی تشریح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے دلکش انداز میں کی ہے۔

---

[1] اردو زبان کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے ایک "آمد" کا ترجمہ حذف کر دیا ہے۔

مولانا مودودی کا ابتدائی جملہ اُن تمام مباحث کا احاطہ کرلیتا ہے جو انھوں نے اپنی طول طویل تحریر میں قاری کی تشفی کے لیے سپردِ قلم کیا ہے۔ مولانا مودودی کا جملہ یہ ہے:

"یہاں حضرت ابراہیم کے اُس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اُن کے لیے حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ بنا۔"[1]

سرسید احمد خاں جو علماء کے حلقے میں اپنی "عقلیت" کے لیے بدنام ترین شخص ہیں انھوں نے بھی درج بالا آیتوں کی تعبیر و تشریح میں خاصی طولانی گفتگو کی ہے اور مولانا مودودی ہی کی طرح "ایک تفکر اور سوچ" کی حالت کا ذکر کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے:

"اِسی حالت میں ایک رات ستارہ اور چاند اور اس کے بعد سورج کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کو وہ خیال آیا جو قرآن مجید میں مذکور ہے پس ضرور نہیں کہ وہ رات پہلی ہی رات ہو جو انھوں نے دیکھی تھی۔"[2]

اس سے لادہ سرسید احمد خاں نے علمائے اسلام کی اِس مشکل کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ ایک طرف تو عقیدے کے مطابق انبیا علیہ السّلام شرک اور کفر کے مرتکب نہیں ہوسکتے اور دوسری طرف خود قرآن میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ستارہ چاند اور سورج کو دیکھ کر اُن میں سے ہر ایک کو اپنا رب قرار دیا۔ "ہٰذا رَبّی" کہنے کی علمائے اسلام نے کلامی اور فلسفیانہ انداز سے بہت سی تاویلیں کی ہیں۔ سرسید احمد خاں کے نزدیک اِن تاویلوں کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ "یہ امر نہایت صاف ہے جس میں کچھ مشکل نہیں" پھر اس "نہایت صاف امر" کی قدرے طویل تاویل کرنے کے بعد آخر کار وہ بھی دوسری آیات کے مطالعے کی مدد سے اُسی نتیجے پر پہونچے ہیں جس پر ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی صدیوں پہلے پہونچ چکے تھے۔ سرسید احمد خاں کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"اِس بیان کی تشریح بعد کی آیات سے بخوبی ہوتی ہے حضرت ابراہیمؑ

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱، ص ۵۵۶

[2] تفسیر القرآن ج ۱، (خدا بخش لائبریری ایڈیشن) تفسیر سورۂ انعام ص ۴۵

نے فرمایا ہے کہ "میں نہیں ڈرتا اُس سے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو" یہ اقوال صاف اِس بات پر دال ہیں جن کی نسبت حضرت ابراہیم نے ربّی کہا تھا، اُن کو مالک اور قادر نفع نقصان پہونچانے پر نہیں[1] مانا تھا"

اس سلسلے میں یہ بات یاد دلانی ضروری ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے لہجے کو ابوحفص نجم الدین عمر بن محمد نسفی ہی کی طرح "استفہام انکاری" قرار دیا ہے اور اِسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے "مفسرین کے اور اقوال بھی ہیں مگر ہمارے خیال میں یہی راجح ہے"[2]۔

درج بالا چند مثالوں سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس فارسی تفسیر کا انداز بیان اور آیتوں کی تشریح وتاویل وتوجیہ کا طریقہ کیا ہے؟ اِس تفسیر نسفی کا شمار اُن تفسیروں میں کرنا مشکل ہے جو کلام پاک کے متن کے ایک ایک لفظ کو کھول کر بیان کرتے ہوئے منشائے الٰہی کو سمجھنے کی سعی وکاوش کرتی ہیں۔ علاوہ براین اس کو مجرد ترجمہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تفسیر دونوں کا ایسا آمیزہ ہے کہ ایک جزو کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک وصف اِس تفسیر کا اِس کا اختصار بھی ہے لیکن اس کے باوجود جہاں تہاں اسرائیلیات کی "جلوہ فرمائیاں" نظر آتی ہیں۔ یہ وہ عیب ہے جس سے شاید ہی کوئی قدیم تفسیر محفوظ ہو۔ اس تفسیر کو مکشوف ہوئے تقریباً ربع صدی کا عرصہ ہونے کو آیا مگر افسوس ہے کہ اردو دنیا اب بھی اس کے وجود سے ناواقف ہے۔ درج بالا سطروں کو تحریر کرنے کا مقصد اہل علم کی توجہ اِس طرف مبذول کرانی ہے کہ اس تفسیر کا بھی تفصیلی مطالعہ ہونا چاہیے اور اُس حاصل مطالعہ سے اردو دنیا کو باخبر کرانا چاہئے۔

---

[1] تفسیر القرآن ج ۱، ص ۴۷

[2] کلام پاک مطبوعہ مدینہ منورہ ص ۱۸۲

احادیث فضائل

ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد سلیم

ذخیرۂ حدیث میں ایک بڑی تعداد ان روایات کی بھی ہے جو ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال کے ابواب میں وارد ہیں۔ ان میں بہت سی صحیح احادیث کے ساتھ موضوع اور گھڑی ہوئی روایات بھی موجود ہیں۔ بلکہ ان کی تعداد شاید صحیح روایات سے زیادہ ہے۔ ان روایات کو بالعموم کم علم زہاد اور جاہل صوفیاء نے لوگوں کی اصلاح و نصیحت کی خاطر وضع کیا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ معاشرہ میں لوگوں کی دلچسپی اعمال صالحہ کی طرف کم ہوتی جارہی ہے اور دین کے منافی کاموں کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے تو انھوں نے اعمال صالحہ کی طرف مائل کرنے اور برائیوں سے باز رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضائل اعمال میں غیر معتبر اور موضوع روایات ذخیرۂ حدیث میں داخل ہونے لگیں۔ ان روایات کو محدثین نے صحیح روایات سے الگ کرنے کی غیر معمولی سعی کی ہے لیکن اس کے باوجود نہ صرف عام واعظین انھیں اپنے خطبات کی زینت بناتے ہیں بلکہ بہت سے علماء و مفسرین نے بھی انھیں اپنی تصنیفات میں بغیر کسی جرح و تنقید کے جگہ دے دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں بہت سی غیر دینی چیزیں مشہور ہوگئیں اور آہستہ آہستہ ان میں دین کے نام پر بعض رسومات اور بدعات نے بھی جنم لیا جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

حدیثیں وضع کرنے والوں میں اگرچہ بعض دوسرے گروہ بھی شامل ہیں لیکن جتنی روایات طبقۂ زہاد نے وضع کیں اتنی کسی نے بھی نہیں وضع کیں۔ ان لوگوں نے اس کام کو کارِ خیر اور خدمت دین سمجھ کر زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش میں ہر اچھی بات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردی۔ چنانچہ حافظ ابن صلاح نے فرمایا:

اعظمهم ضررا قوم من	حدیث میں سب سے بڑا نقصان ان
المنسوبين الى الزهد وضعوا	لوگوں کی طرف سے پہونچا جو زہد سے
الاحاديث احتسابا فيما	تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حدیثوں
زعموا[۱]	کو اپنے خیال میں ثواب کی نیت سے وضع کیا۔

اسی طرح یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا:

لم نجد الصالحين	طبقۂ صالحین سے زیادہ ہم کسی کو حدیث
اكذب منهم فى الحديث[۲]	کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں پاتے۔

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے حدیثیں وضع کیں مثلاً غلام خلیل سے جب ان احادیث کی سند کے بارے میں پوچھا گیا جنھیں وہ رقائق کے باب میں بیان کرتا تھا تو اس نے کہا:

وضعناها لنرقق بها	ہم نے ہی انھیں وضع کیا تاکہ لوگوں
قلوب العامة[۳]	کے قلوب نرم ہوں۔

ابن جوزی نے بیان کیا ہے کہ غلام خلیل بہت بڑا زاہد اور شہوات ولذات دنیا سے الگ تھلگ رہنے والا ایک نیک انسان تھا۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے وہ عوام میں اتنا مقبول تھا کہ انتقال کے وقت اہل بغداد نے اس کے سوگ میں بازار تک بند کردئے تھے۔ اس کے باوجود وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔[۴]

انہی میں ایک شخص میسرہ بن عبد ربہ بھی تھا جو فضائل قرآن سے متعلق بہت سی روایات بیان کرتا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ان حدیثوں کی سندیں کیا ہیں تو اس نے جواب دیا:

وضعتها ارغب الناس	ان روایات کو میں نے وضع کیا ہے۔
فيها[۵]	اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں ان کی طرف
	رغبت پیدا ہو۔

اسی طرح ابوعصمہ نوح بن مریم القرشی جو 'مرو' میں قضاء کے عہدہ پر فائز تھا۔ اسے تفسیر، حدیث، فقہ اور مغازی میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے تفسیر کلبی اور مقاتل سے،

حدیث حجاج بن ارطاۃ سے، فقہ امام ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ سے اور مغازی ابن اسحاق سے حاصل کی اس شخص کو مختلف کمالات کا جامع ہونے کی وجہ سے 'نوح الجامع' بھی کہا جاتا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ زیادہ تر لوگ امام ابوحنیفہ کی فقہ اور ابن اسحاق کی مغازی میں دلچسپی لینے لگے ہیں تو اس نے قرآن کی سورتوں کے فضائل میں حدیثیں وضع کرنی شروع کر دیں۔ جب اس سے ایک حدیث کی سند کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا:

انی رأیت الناس قد اعرضوا	میں نے جب دیکھا کہ لوگ قرآن سے دور
عن القرآن و اشتغلوا بفقه	ہوتے جا رہے ہیں اور ابوحنیفہ کی فقہ اور
ابی حنیفة ومغازی ابن	ابن اسحاق کی مغازی میں زیادہ دلچسپی
اسحاق فوضعت هٰذا	لینے لگے ہیں تو میں نے عند اللہ اجر کی امید
الحدیث حسبة[۱]	میں اسے وضع کیا۔

اعمال صالحہ کی ترغیب میں ابوعبداللہ محمد بن الکرام السجستانی اور اس کے اصحاب جنھیں 'کرامیہ' کے نام سے جانا جاتا ہے، وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے[۲] اگرچہ ابن الکرام بجائے خود ایک نیک اور زاہد شخص تھا۔

اسی طبقہ سے منسوب محمد بن سعید نامی ایک شخص کہا کرتا تھا:

لا بأس اذا کان کلام	کلام حسن کے لیے اسناد وضع کرنے
حسن ان نضع له اسنادا[۳]	یعنی ہر اچھی بات کو حدیث بنا دینے میں
	کوئی حرج نہیں۔

اس طبقہ نے فضائل قرآن اور عبادات جیسے نماز، روزہ وغیرہ کی فضیلت میں بیشمار حدیثیں وضع کیں۔ ذیل میں ان کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

من قرأ آیة الکرسی	جس نے نماز کے بعد آیۃ الکرسی کی تلاوت
فی دبر صلاة لم یمنعه	کی اسے موت کے سوا کوئی چیز جنت
من دخول الجنة الا	میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی
الموت ومن قرأها	اور جس شخص نے سوتے وقت اس کی
حین یأخذ مضجعه	تلاوت کی تو اللہ اس کے مکان اور اس کے
امنه الله علی داره ودار	پاس پڑوس اور ارد گرد کے مکانوں کی

جارہ ودویرات حولہ[۵] حفاظت کرتا ہے۔

اس روایت کی سند میں 'حیہ' اور 'نہشل' ضعیف اور کذاب راوی ہیں اس وجہ سے ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

من قرأ فی لیلۃ بالم تنزیل	جس نے رات میں الم تنزیل الکتاب یٰسٓ
الکتاب ویٰسٓ واقتربت الساعۃ	اقترب الساعۃ، تبارک الذی بیدہ الملک
وتبارک الذی بیدہ الملک	سورتوں کی تلاوت کی تو وہ اس کے لیے
کن لہ نورا وحرزا من الشیطان	نور ہوں گی اور شیطان اور شرک سے اس
والشرک ورفع لہ درجات یوم	کی حفاظت کریں گی اور قیامت میں اس
القیٰمۃ[۱]	کے درجات بلند ہوں گے۔

اس روایت کی سند میں 'الحکم' نامی کذاب راوی ہونے کی وجہ سے طاہر پٹنی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

من قرأ سورۃ الواقعۃ کل	جس شخص نے ہر رات سورہ واقعہ کی تلاوت
لیلۃ لم یصبہ فاقۃ ابدا	کی اسے کبھی فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی اور
ومن قرأ لا اقسم بیوم القیامۃ	جو شخص لا اقسم بیوم القیمۃ کی تلاوت کرے گا
لقی اللہ یوم القیمۃ ووجہہ	وہ قیامت میں خدا سے اس حال میں
فی صورۃ القمر لیلۃ	ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے
البدر[۲]	چاند کی مانند روشن ہوگا۔

اس روایت کو امام احمد نے منکر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند میں 'شجاع' اور 'السری' نامی دو راوی مجہول ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں ایک راوی احمد الیمامی ہے جو کذاب ہے اسی بنا پر ابن جوزی نے اسے موضوع روایتوں میں داخل کیا ہے۔

مفسرین نے اپنی تفاسیر میں سورتوں کے اول یا آخر میں ان کی فضیلت سے متعلق جو احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر موضوع ہیں۔ مفسرین میں ابوبکر بن مَرْدَوَیہ، واحدی، ابو اسحاق الثعلبی، ابوقاسم الزمخشری، قاضی بیضاوی اور ابوبکر بن داؤد الحافظ وغیرہ نے اپنی تفسیروں میں ان روایات کو نقل کیا ہے۔ البتہ قرآن کی سورتوں کے فضائل میں مندرجہ ذیل روایات صحیح ہیں۔

ما انزلت فی التوراۃ ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی الفرقان مثلها وانها سبع من المثانی [۱۲]

سورہ فاتحہ جیسی سورت نہ توراۃ میں ہے نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ قرآن میں یہی سبع مثانی ہے۔

من قرأ الآیتین فی اٰخر سورۃ البقرۃ فی لیلۃ کفتاہ [۱۳]

رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی تلاوت پورے شب (کی عبادت یا حفاظت) کے لیے کافی ہیں۔

سیدۃ اٰی القرآن ھی اٰیۃ الکرسی [۱۴]

آیۃ الکرسی قرآن کی سورتوں کی سردار ہے۔

اقرؤا الزھراوین البقرۃ وسورۃ اٰل عمران فانھما یاتیان یوم القیمۃ کانھما غمامتان او کانھما غیایتان او کانھما فرقان من طیر صواف تحاجان عن اصحابھما [۱۵]

(زہراوین (دو چمکتی سورتیں) سورۃ البقرہ اور آل عمران کی تلاوت کرو۔ یہ دونوں قیامت کے دن اپنے تلاوت کرنے والے پر دو بادل یا دو سائبان یا اڑتے ہوئے پرندوں کی دو ٹکڑیوں کے مانند آئیں گی اور اپنے پڑھنے والے کی طرف سے حجت کریں گی۔

اوتیتھما لم یوتھما من قبلک فاتحۃ الکتاب وخواتیم سورۃ البقرۃ [۱۶]

سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں صرف آپؐ کو دی گئی ہیں۔ ان کے مثل آیتیں آپؐ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔

ان البیت الذی تقرأ البقرۃ فیہ لا یدخلہ الشیطان [۱۷]

جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہے اس میں شیطان نہیں داخل ہوتا۔

اذا اویت الی فراشک فاقرأ اٰیۃ الکرسی لن یزال من اللہ حافظا ولا یقربک شیطان حتی تصبح [۱۸]

جب تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو آیۃ الکرسی کی تلاوت کرو۔ اس طرح صبح تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہو گے اور شیطان تم سے قریب نہیں ہوگا۔

من حفظ عشر اٰیات من

سورہ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کا

اول سورۃ الکہف عصم من فتنۃ الدجال[۱۹]	حفظ کرنے والا فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔
قل ھو اللہ احد ثلث القرآن[۲۰]	قل ہو اللہ احد کی تلاوت ثواب میں ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔
ایات انزلت اللیلۃ لم یُر مثلھن قط قل اعوذ برب الفلق وقل اعوذ برب الناس[۲۱]	آج رات جو آیتیں مجھ پر نازل ہوئیں ان کے مانند آیتیں کبھی نازل نہیں ہوئیں اور وہ ہیں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس
تعوذ بھما فما تعوذ متعوذ بمثلھما[۲۲]	ان سورتوں (یعنی سورۂ فلق اور سورہ ناس) کے ذریعہ اللہ کی پناہ طلب کرو۔ ان کے مثل کوئی سورت ایسی نہیں ہے جس کے ذریعہ کسی شخص نے پناہ طلب کی ہو۔

ان کے علاوہ سورتوں کے فضائل میں مندرجہ ذیل روایات ضعیف ہیں۔

اذا زلزلت عدلت لہ بنصف القرآن[۲۳]	اذا زلزلت کی تلاوت ثواب میں نصف قرآن کے برابر ہے
قل یا یھا الکفرون عدلت لہ بربع القرآن[۲۴]	قل یا یھا الکافرون کی تلاوت ثواب میں چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔
ھی المنجیۃ تنجیہ من عذاب القبر[۲۵]	سورہ ملک کی تلاوت عذاب قبر سے نجات دلانے والی ہے۔
ان سورۃ من القرآن ثلاثون ایۃ شفعت لرجل حتی غفرلہ وھی تبارک الذی بیدہ الملک[۲۶]	قرآن کی تیس آیات والی سورت (یعنی سورۂ ملک) قیامت میں اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرے گی یہاں تک کی اس کی مغفرت کردی جائے گی اور وہ تبارک الذی بیدہ الملک ہے۔

سورتوں کے فضائل میں درج بالا احادیث کے علاوہ کوئی بھی روایت صحیح نہیں۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ان سورتوں کے علاوہ وہ تمام روایات جن میں یہ

کہا گیا ہو کہ جس نے یہ سورت پڑھی اس کے لیے ایسا ہے ویسا ہے وہ سب موضوع ہیں۔[۲۷]
اسی طرح بہت سی روایات میں مخصوص اوقات میں مخصوص کیفیتوں کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور مخصوص ایام میں روزہ رکھنے کی بے پناہ فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں سے بھی اکثر و بیشتر روایات موضوع ہیں۔ مثلاً

من قرأ لیلۃ النصف من	نصف شعبان کی رات جو شخص سورکعتوں
شعبان الف مرۃ قل ھو اللہ	میں ایک ہزار مرتبہ قل اللہ احد پڑھے گا وہ
احد فی مائۃ رکعۃ لم یخرج من	دنیا سے جب جائے گا تو قبر میں تیس فرشتے
الدنیا حتی یبعث اللہ الیہ فی	اسے جنت کی بشارت دیں گے اور تیس
منامہ مائۃ ملک ثلثون یبشرونہ	فرشتے اسے عذاب جہنم سے بچائیں گے
بالجنۃ وثلثون یؤمنونہ من	اور تیس فرشتے اسے غلطی سے محفوظ رکھیں
النار وثلثون یعصمونہ من ان	گے اور دس فرشتے اس کے دشمنوں کے
یخطئ وعشر یکیدون من عاداہ[۲۸]	خلاف اس کا دفاع کریں گے

اس روایت کے تمام طرق میں مجہول، ضعیف اور غیر معتبر راوی موجود ہیں۔ اسی لیے ابن جوزی نے اسے موضوع روایتوں میں شمار کیا ہے۔
ابن قیم نے لکھا ہے کہ پندرہ شعبان کی رات میں نماز کی فضیلت سے متعلق کوئی روایت صحیح نہیں۔[۲۹]
اس رات عبادت سے متعلق بعض روایات حدیث کی مستند کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ان کی سند صحیح نہیں۔ مثلاً ابن ماجہ کی یہ روایت:

عن عائشۃ قالت فقدت	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ
ذات لیلۃ فخرجت اطلبہ	صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس نہیں
فاذا ھو بالبقیع راقع راسہ	پایا تو آپ کو تلاش کرنے کے لیے
الی السماء فقال یا عائشہ	نکلی۔ میں نے دیکھا آپ جنت البقیع
اکنت تخافین ان یحیف	میں ہیں اور سر آسمان کی طرف اٹھائے
اللہ علیک ورسولہ قالت	ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر آپ نے فرمایا

قد قلت ومابی ذالك ولكنی ظننت انك اتيت بعض نساءك فقال ان الله ينزل ليلة النصف من شعبان الی السماء الدنيا فيغفر لاكثر من عدد شعر غنم كلب[۳۰]

اے عائشہ کیا تمہیں اس بات کا خوف ہوا کہ اللہ اور اس کا رسول تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے گا میں نے کہا یہ بات نہیں بلکہ میرا خیال تھا کہ آپ اپنی بعض ازواج کے پاس تشریف لے گئے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات سماء دنیا کی طرف نزول کرتا ہے اور بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں لوگوں کی مغفرت کرتا ہے۔

اس روایت کو اسی سند سے امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے[۳۱] ساتھ ہی اس کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

حديث عائشة لانعرفه الا من هذا الوجه

حضرت عائشہ کی اس حدیث کو ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں

اس میں ایک راوی حجاج ہیں۔ میں نے سنا کہ امام بخاری اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یحییٰ بن ابی کثیر نے عروہ سے نہیں سنا اور حجاج نے یحییٰ بن ابی کثیر سے نہیں سنا۔

اس طرح اس روایت کی سند دو جگہ سے منقطع ہے۔ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا کہ یہ روایت مختلف سندوں سے مروی ہے لیکن سب مضطرب اور غیر ثابت شدہ ہیں[۳۲]

ابن ماجہ نے اسی سلسلہ کی ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس طرح ہے:

ان الله ليطلع فی ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه الا لمشرك او مشاحن[۳۳]

نصف شعبان کی رات اللہ تعالیٰ تجلی فرماتا ہے اور اپنے بندوں میں تمام لوگوں کی بخشش کرتا ہے سوائے شرک اور بغض وعداوت رکھنے والے کے۔

یہ روایت مسند احمد میں بھی ہے لیکن اس میں لفظ 'مشرک' کے بجائے 'قاتل نفس' آیا ہے[۳۴]۔

اس کی سند میں ایک راوی 'ابن لہیعہ' ہیں جنھیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا کہ وہ ذاہب الحدیث ہیں[۳۵] یعنی ان کی حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں۔

ابن لہیعہ اگرچہ اکابر علماء میں سے تھے وہ مصر میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ ان کے پاس حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا لیکن ایک موقع پر ان کی تمام کتابیں جل گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے جب حافظہ کی مدد سے حدیثوں کی روایت شروع کی تو ان سے غلطیاں سرزد ہونے لگیں۔ چنانچہ محدثین نے اسی بنیاد پر انھیں ضعیف اور متروک قرار دیا ہے[۳۶]۔ امام احمد ان کی روایات کو صرف متابعات اور شواہد ہی میں نقل کرتے تھے۔

اس طرح کی بعض دوسری روایات بیہقی اور طبرانی نے بھی نقل کی ہیں لیکن وہ سب مرسل اور ضعیف ہیں ان میں ایک بھی روایت صحیح نہیں[۳۷]۔

اسی طرح پندرہ شعبان کے روزہ کے متعلق بھی کوئی روایت صحیح سند سے مروی نہیں۔ مثلاً ایک روایت ہے:

اذا کانت لیلۃ النصف	جب نصف شعبان کی رات آئے
من شعبان فقوموا لیلہا	تو اس میں عبادت کرو اور اس کے دن
وصوموا نہارہا فان	میں روزہ رکھو اس لیے کہ اس رات
اللہ ینزل فیہا لغروب	اللہ رب العزت غروب شمس کے بعد
الشمس الی سماء الدنیا	سماء دنیا کی طرف نزول کرتا ہے اور کہتا
فیقول الا من مستغفرلی	ہے کہ ہے کوئی مغفرت طلب کرنے
فاغفرلہ الا مسترزق	والا کہ میں اس کی مغفرت کردوں۔ ہے
فارزقہ الا مبتلی فاعافیہ	کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اسے
الا کذا الا کذا حتی	رزق عطا کردوں۔ ہے کوئی پریشانی میں
یطلع الفجر[۳۸]	مبتلا کہ میں اس کی پریشانی دور کردوں۔ ہے
	کوئی ایسا۔ ہے کوئی ایسا۔ یہ اعلان طلوع
	فجر تک ہوتا رہتا ہے۔

اس روایت کو ابن ماجہ نے ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی سبرۃ القرشی سے نقل کیا ہے۔ انھیں امام بخاری اور امام نسائی نے ضعیف اور متروک قرار دیا ہے۔ امام احمد کے بیٹے عبداللہ اور صالح نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں وضع کرتے تھے[۳۹]

خلاصہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پندرہ شعبان کی رات میں نماز پڑھنے اور دن میں روزہ رکھنے سے متعلق صحیح احادیث سے کچھ بھی ثابت نہیں البتہ مرسل (جس کی سند میں انقطاع ہو) اور ضعیف قسم کی روایات سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اس رات زیادہ سے زیادہ عبادت کرنا مستحب ہے لیکن اس میں بندہ کو اختیار رہے کہ عبادت کا جو طریقہ بھی چاہے اختیار کرے لیکن اس پر دوام نہ کرے۔ اس لیے کہ مستحب اور نفلی عبادات میں دوام درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس رات انفرادی طور پر عبادت کرے۔ جماعت اور اجتماع اور مخصوص کیفیتوں کے ساتھ نمازوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا[۴۰] اسی طرح اس میں پوری رات جاگنا بھی سنت ثابتہ کے خلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

لا اعلم رسول اللہ صلی	میں نہیں جانتی کہ آپؐ نے کسی رات
اللہ علیہ وسلم قرأ القرآن	میں پورا قرآن پڑھا ہو یا کسی رات آپ
کلہ فی لیلۃ ولا قام لیلۃ	صبح تک عبادت میں جاگے ہوں یا کسی
حتی الصباح ولا صام شہرا	مہینہ کے مکمل روزہ رکھے ہوں
کاملا غیر رمضان[۴۱]	سوائے رمضان کے۔

پندرہ شعبان کے روزہ کے علاوہ یوم عاشورہ کے فضائل میں بھی بہت سی روایات وارد ہیں لیکن ان میں اس دن روزہ رکھنے کے علاوہ دیگر فضائل بیان کرنے والی تمام روایات موضوع ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل روایات:

من صام یوم عاشوراء کتب	جس نے یوم عاشورا کا روزہ رکھا
اللہ لہ عبادۃ ستین سنۃ	اللہ اس کے لیے ساٹھ سال کی عبادت
من صام یوم عاشورا اعطی	کا ثواب لکھے گا جس نے اس دن
ثواب عشرۃ آلاف شہید	روزہ رکھا اسے دس ہزار شہیدوں
من افطر عندہ مومن	کا ثواب دیا جائے گا جس نے اس

یوم عاشورا فکانما اطعم جمیع	دن کسی روزہ دار کو افطار کرایا گویا اس نے
فقراء امۃ محمد واشبع بطونہم	امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فقراء کو
خلق اللہ السمٰوٰت والارض کمثلہ	پیٹ بھر کھانا کھلایا۔ اسی دن اللہ نے
وخلق القلم یوم عاشوراء واللوح	زمین و آسمان، لوح و قلم، جبرئیل و ملائکہ
مثلہ وخلق جبرئیل یوم عاشوراء وملائکتہ	اور حضرت آدمؑ کو پیدا کیا، اسی دن اللہ
یوم عاشوراء وخلق آدم یوم عاشوراء	رب العزت عرش پر مستوی ہوا اور
واستوی الرب عزوجل علی العرش یوم	قیامت بھی اسی دن آئے گی۔
عاشوراء ویوم القیمۃ یوم عاشوراء[۴۲]	

ان روایات کی سند میں ایک راوی 'حبیب' ہے اس کے بارے میں ابن جوزی نے کہا ہے: ھو افۃ (وہ ایک مصیبت ہے) ابن جوزی نے اس طرح کی تمام روایات کو موضوع قرار دیا ہے۔

اس سلسلہ کی بعض دوسری موضوع روایات یہ ہیں۔

من اکتحل بالاثمد یوم	جو شخص عاشورا کے دن اثمد کا سرمہ
عاشوراء لم ترمد عینہ ابدا[۴۳]	لگائے گا اسے کبھی آشوب چشم نہ ہوگا۔
من وسع علی عیالہ یوم	جو شخص یوم عاشوراء میں اپنے عیال پر
یوم عاشوراء وسع اللہ علیہ	فراخی کرے گا اللہ اسے پورے سال
سائر سنتہ[۴۴]	وسعت دے گا۔
مامن عبد یبکی یوم قتل	جو شخص قتل حسین کے دن روئے گا
حسین الا کان یوم القیمۃ	قیامت کے دن وہ اولوالعزم رسولوں
مع اولی العزم من الرسل[۴۵]	کے ساتھ ہوگا۔

ان روایات کی بابت ملا علی القاری لکھتے ہیں:

"یوم عاشوراء میں سرمہ لگانا، زینت اختیار کرنا، اہل و عیال پر فراخی کرنا، نمازیں پڑھنا اور دیگر فضائل بیان کرنے والی روایات میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ صرف وہ احادیث صحیح ہیں جن میں یوم عاشورا کے روزہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ بقیہ تمام روایات باطل ہیں۔ انھیں کذابین نے وضع کیا ہے۔ ان کے مقابلہ میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس دن کو سوگ

اور غم کے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ بدعتی ہیں"[۲۶]

اسی طرح وہ تمام روایات بھی باطل ہیں جن میں یوم عاشورا کے موقع پر مختلف اوراد و وظائف اور مخصوص اعمال اور نمازوں کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں:

"کتب اوراد و وظائف میں عاشورا کے دن بعض مخصوص اعمال سے متعلق احادیث وارد ہیں ان میں اکثر موضوع ہیں۔ اسی طرح اس دن مخصوص نمازوں سے متعلق تمام روایات موضوع ہیں"۔[۲۷]

البتہ یوم عاشورا کے سلسلہ میں صحیح روایات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دن روزہ رکھنا مستحب ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

قدم النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ
وسلم المدینۃ فوجد	تشریف لائے تو وہاں کے یہود کو اس دن
الیہود صیاما فقال ماھٰذا	روزہ رکھتے دیکھا، آپ نے پوچھا کہ یہ
قالوا ھٰذا یوم انجا اللہ	کیسا روزہ ہے تو لوگوں نے کہا کہ اس
فیہ موسیٰ واغرق فیہ	دن اللہ نے حضرت موسیٰ کو نجات
فرعون فصامہ موسیٰ شکرا	دی اور فرعون کو غرق کیا اس لیے موسیٰ
فقال رسول اللہ صلی	نے اس دن بطور شکر روزہ رکھا تھا۔
اللہ علیہ وسلم نحن	آپ نے فرمایا کہ ہم موسیٰ کی موافقت
احق بموسیٰ منکم	میں تمہارے مقابلہ میں اس دن روزہ
فصامہ وامر بصیامہ[۲۸]	رکھنے کے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ آپ
	نے اس دن روزہ رکھا اور لوگوں کو
	بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔

اسی طرح امام ترمذی نے بھی اسی سلسلہ کی ایک روایت حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں:

کان عاشوراء یوم تصومہ	عہد جاہلیت میں قریش یوم عاشورا
قریش فی الجاھلیۃ وکان	کا روزہ رکھتے تھے جب رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے،

یصومہ فلما قدم المدینۃ صامہ	تو آپ نے بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو
وامر الناس بصیامہ فلما افترض	بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا۔
رمضان کان رمضان ھو الفریضۃ	لیکن جب رمضان کے روزے فرض
وترک عاشوراء فمن شاء صامہ	ہو گئے تو اس دن کا روزہ ترک کر دیا گیا
ومن شاء ترکہ[۵۹]	اب جس کا جی چاہتا رکھتا جو جی چاہتا نہیں رکھتا تھا۔

صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم عاشورا کا روزہ رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل ہے۔ چنانچہ امام مسلم نے ایک حدیث نقل کی کہ آپؐ نے فرمایا:

افضل الصیام بعد رمضان	رمضان کے روزوں کے بعد سب سے
شہر اللہ المحرم[۶۰]	افضل محرم کا روزہ ہے۔

ان احادیث کی بنیاد پر اس دن کا روزہ مستحب ہے اور بہتر ہے کہ اس کے ساتھ نویں یا گیارہویں تاریخ کا بھی روزہ رکھ لیا جائے کیونکہ یہود صرف یوم عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

خالفوا فیہ الیہود	یہود کی مخالفت کرو اور یوم عاشورا کے
صوموا قبلہ یوما او بعدہ	ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی
یوما[۶۱]	روزہ رکھو۔

یوم عاشورا میں روزہ کے علاوہ اس دن کی فضیلت کے سلسلہ میں تمام روایات موضوع ہیں۔ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں:

کل ذالک کذب علی رسول	یوم عاشورا میں روزہ کی فضیلت
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم	کے علاوہ تمام روایات جھوٹی ہیں۔
یصح فی عاشورا الا فی فضل صیامہ[۶۲]	

علی القاری نے فرمایا:

لا یصح منہا شئ ولا حدیث	یوم عاشورا میں حدیث صیام کے
واحد غیر حدیث صیامہ	علاوہ ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔

اسی طرح ماہ رجب کے مختلف ایام میں روزہ رکھنے اور ان کی راتوں میں نماز پڑھنے کی فضیلت میں بھی بہت سی روایات وارد ہیں وہ سب بھی موضوع ہیں۔ جیسے

مندرجہ ذیل روایات :

ان فی رجب یوما ولیلۃ من	ماہ رجب میں ایک دن اور ایک رات
صام ذالك الیوم وقام تلك	ایسی ہے کہ جس نے اس دن روزہ رکھا
اللیلۃ کان لہ من الاجر	اور اس رات عبادت کی گویا اس نے
کمن صام مئۃ سنۃ [۵۴]	سو سال کے روزے رکھے۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی ہیاج الہروی ہے جو متروک ہے۔ اس روایت کو حافظ ابن حجر نے انتہائی درجہ کی منکر قرار دیا ہے۔ ابن معین نے اسے ضعیف اور ابو داؤد نے اسے متروک کہا ہے [۵۵]

من صلی المغرب اول لیلۃ	جس نے ماہ رجب کی پہلی رات میں
من رجب ثم صلی بعدھا	مغرب کے بعد دس سلام سے بیس رکعت
عشرین رکعۃ یفاتحۃ	نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ کے
الکتاب وقل ھو اللہ احد مرۃ	بعد قل ہو اللہ احد پڑھا..... اللہ اس
ویسلم فیھن عشر تسلیمات...	کی جان و مال اور اہل و اولاد کی
حفظہ اللہ تعالیٰ فی نفسہ وما لہ و	حفاظت کرے گا، وہ عذاب قبر
اھلہ وولدہ واجیر من عذاب القبر	سے نجات پائے گا اور پل صراط پر بجلی
وجاز علی الصراط کالبرق [۵۶]	کے مانند گزر جائے گا۔

ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس روایت کے اکثر راوی مجہول ہیں اور یہ روایت موضوع ہے :

لا تغفلوا عن اول جمعۃ من	رجب کے پہلے جمعہ کی رات سے
رجب فانھا لیلۃ تسمیھا الملائکۃ	غافل نہ ہو اس لیے کہ فرشتے اس کو
الرغائب [۵۷]	رغائب کہتے ہیں۔

یہ روایت باتفاق محدثین موضوع ہے اس کی سند میں سوائے حمید اور انس کے تمام راوی ایسے ہیں جن سے کوئی روایت قابل قبول نہیں کیونکہ ان میں بہت سے مجہول ہیں اور بعض کذاب بھی ہیں۔ صلاۃ الرغائب کی ابتداء ۴۸۰ھ میں ہوئی اس کو وضع کرنے والا شیخ الصوفیہ عبداللہ بن جہم ہے۔ حافظ ابن قیم نے صلاۃ الرغائب کے متعلق روایات

کے بارے میں فرمایا ہے۔

احادیث صلاۃ الرغائب	رجب کے پہلے جمعہ کی رات میں صلاۃ
لیلۃ اول جمعۃ من رجب	الرغائب سے متعلق تمام روایات
کلہا کذب [۵۸]	جھوٹی ہیں۔

اسی طرح ماہ رجب کی دیگر راتوں میں عبادت کرنے اور دن میں روزہ رکھنے کے فضائل میں وارد تمام روایات کو بھی ابن قیم نے موضوع قرار دیا ہے۔[۵۹]

ایسے ہی وہ تمام روایات بھی موضوع ہیں جن میں ہفتہ کے الگ الگ دن ورات میں نماز پڑھنے کی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً

من صلی لیلۃ السبت	جس نے شنبہ کی رات چار رکعت
اربع رکعات یقرء فی کل رکعۃ	نماز پڑھی اور اس میں فاتحۃ الکتاب ایک
فاتحۃ الکتاب مرۃ وقل	مرتبہ اور قل ہو اللہ احد پچیس مرتبہ پڑھا
ہو اللہ احد خمسا وعشرین	اللہ اس کے جسم کو آگ کے لیے حرام
حرم اللہ جسدہ علی النار [۶۰]	کردے گا۔

اس روایت کے بیشتر راوی مجہول ہیں۔ 'یزید' اور 'ہیثم' ضعیف اور متروک ہیں۔ ایک دوسرے راوی 'بشر' کے بارے میں ابن جوزی نے فرمایا کہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں۔ ایک راوی احمد بن عبداللہ الجویباری ہے جو حدیثیں وضع کرتا تھا۔

ہفتہ کے الگ الگ دن ورات کی نمازوں کی فضیلت میں وارد احادیث کے سلسلہ میں ابن قیم نے فرمایا ہے۔

احادیث صلوات الایام	مختلف دنوں اور راتوں کی نمازیں
واللیالی کصلوۃ یوم الاحد	جیسے پیر کے دن اور رات کی نمازیں،
ولیلۃ الاحد ویوم الاثنین	منگل کے دن ورات کی نمازیں اسی
ولیلۃ الاثنین الی اخر الاسبوع	طرح آخر ہفتہ تک کی دن ورات کی
کل احادیثہا کذب [۶۱]	نمازوں کی فضیلت میں وارد تمام روایات باطل ہیں۔

اسی طرح لیلۃ الفطر، یوم عرفہ میں ظہر وعصر کے درمیان اور یوم النحر کی رات میں پڑھی جانے والی مخصوص نمازوں کے متعلق مولانا عبدالحئی لکھنوی نے لکھا ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔[۶۲]

فضائل اعمال میں مذکورہ بالا امور کے علاوہ ذکر و دعا، درود و استغفار، حسن اخلاق اور فرض عبادات خصوصاً نماز اور رمضان کے روزوں کے فضائل میں بہت سی روایات وارد ہیں جنھیں اسی طبقہ نے وضع کیا تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کو اعمال صالحہ کی طرف مائل کیا جاسکے اور برائیوں کے ارتکاب سے باز رکھا جاسکے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں۔

قوم وضعوا الاحادیث فی	ایک طبقہ نے ترغیب و ترہیب
الترغیب والترھیب لیحثوا	کے ابواب میں حدیثوں کو وضع کیا تاکہ
الناس بزعمھم علی الخیر	وہ بزعم خود لوگوں کو خیر پر آمادہ کر سکیں
ویزجروھم عن الشر[۶۳]	اور انھیں شر سے باز رکھ سکیں۔

ان لوگوں سے جب یہ کہا جاتا کہ رسولؐ کے نام پر حدیثیں وضع کرنا جائز نہیں۔ آپؐ نے حدیثیں وضع کرنے اور انھیں بیان کرنے والے کے خلاف سخت وعید بیان فرمائی ہے تو کہتے کہ ہم رسولؐ پر نہیں بلکہ رسولؐ کے لیے جھوٹ بولتے ہیں[۶۴] گویا ان کی نگاہ میں آپؐ کی لائی ہوئی شریعت ناقص تھی جس کی وہ اپنے فعل (وضع حدیث) سے تکمیل کر رہے تھے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر کبار محدثین اس طبقہ کی ایک بھی روایت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔ مشہور محدث یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ میں جس آدمی کو ایک لاکھ دینار کی امانت کے لیے صحیح سمجھتا ہوں اسے ایک حدیث کے لیے امین نہیں سمجھتا[۶۵]

اسی طرح امام مالک نے ایک مرتبہ مسجد نبوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان ستونوں کے پاس ستر راویوں کو حدیث بیان کرتے ہوئے پایا مگر میں نے ان سے ایک بھی حدیث نہیں قبول کی اگر ان کو بیت المال کا امین بنا دیا جاتا تو وہ امانتدار ثابت ہوتے مگر وہ اس عظیم کام کے اہل نہ تھے[۶۶]

ذخیرۂ حدیث میں موضوع روایات کا ایک بڑا حصہ انہی زہاد و صوفیا کی طرف سے داخل ہو گیا۔ ان میں بہت سی روایات ایسی ہیں جن میں مختلف موقعوں پر بعض مخصوص اعمال کی خود ساختہ یا حد سے زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ان روایات کی وجہ سے امت میں بدعات اور غیر دینی رسومات نے جنم لیا جنھیں خاص طور پر برصغیر کے عوام دین کا جزو سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ جبکہ ان رسومات کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

محدثین اور نقد حدیث

فضائل اعمال سے متعلق روایات کا تعلق [illegible] کہ احکام سے نہیں ہوتا اور نہ ان سے

کوئی شرعی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے اس لیے عام محدثین نے ان کی تحقیق وتنقید کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں۔

اذا روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الحلال و الحرام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا رویناً فی الفضائل والثواب والعقاب سہلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال[۶۷]	جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال وحرام سے متعلق کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو اسانید کی تحقیق سختی سے کرتے ہیں اوران کے رجال پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب و عقاب سے متعلق کوئی روایت نقل کرتے تو اسانید کی جانچ وپرکھ میں نرمی کرتے ہیں اوران کے رجال کی تنقید میں تسامح کرتے ہیں۔

اسی طرح حافظ ابن حجر نے فرمایا:

قد ثبت عن الامام احمد وغیرہ من الائمۃ انہم قالوا اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا[۶۸]	امام احمد اور دوسرے ائمہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا جب ہم حلال وحرام سے متعلق روایت نقل کرتے ہیں تو نقد اسناد میں سختی کرتے ہیں اور جب فضائل وغیرہ سے متعلق روایات نقل کرتے ہیں تو تساہل برتتے ہیں

اسی طرح کے اقوال سفیان ثوری، سفیان بن عُیینہ، یحییٰ بن محمد، زکریا عنبری، حافظ ابن عبدالبر، امام نووی اور حافظ ابن صلاح وغیرہ جیسے مشہور محدثین سے بھی منقول ہیں[۶۹]

یہی وجہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں فضائل اعمال سے متعلق روایات کی احکام ومسائل سے متعلق روایات کی طرح تہذیب وتنقیح نہ ہوسکی جس کے نتیجہ میں ان میں بہت سی ضعیف اور موضوع روایات باقی رہ گئیں۔ اس طرح کی روایات زیادہ تر کتب حدیث کے تیسرے اور چوتھے طبقہ میں پائی جاتی ہیں جن کے قبول حدیث کے شرائط

کتب صحاح (جیسے بخاری و مسلم) اور کتب سنن (جیسے ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) کے مقابلہ میں کمتر تھے "صحاح ستہ" میں ایسی روایات بہت کم ہیں۔

محدثین میں ابن جوزی، حافظ ابن قیم، علامہ سیوطی، حافظ عراقی، ملا علی قاری، قاضی شوکانی اور طاہر پٹنی وغیرہ نے ان کتب کی موضوع روایات کو موضوعات سے متعلق اپنی کتب میں جمع کر دیا ہے۔ یہ محدثین کسی حدیث پر نہ صرف سنداً نقد کرتے ہیں بلکہ اس کے متن کی گہرائی تک جا کر اس کی اچھی طرح جانچ اور پرکھ کرتے ہیں۔ جن روایات کو ان محدثین نے موضوع قرار دیا ہے ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام روایات ایسی ہیں جن میں معمولی سے عمل پر بہت بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا جاتا ہے یا چھوٹی سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے۔ یہ روایات، رجال میں نقص یا کوتاہی پائے جانے کے علاوہ اصول درایت کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ محدثین نے بیان کیا ہے کہ جن روایات میں چھوٹے کام پر بھاری ثواب کا وعدہ ہو یا ادنیٰ سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہو وہ موضوع قرار پائیں گی۔[۱]

موضوع حدیث کی روایت اور اس پر عمل

کسی موضوع روایت کا نقل کرنا یا بیان کرنا سخت ترین گناہ ہے۔ چنانچہ مختلف طرق سے مروی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من کذب علی متعمدًا — جس نے میری جانب جان بوجھ
فلیتبوأ مقعدہ من النار[۲] — کر جھوٹ منسوب کیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

اسی لیے تمام فقہاء و محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موضوع روایت کا بیان کرنا خواہ کسی بھی مقصد کے لیے ہو حرام ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی فرماتے ہیں۔

"فقہاء اور محدثین نے متفقہ طور پر اس بات کی صراحت کی ہے کہ موضوع روایت کو بیان کرنا، اسے نقل کرنا اور اسے صحیح سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرنا حرام ہے خواہ وہ احکام سے متعلق ہوں، یا قصص سے یا ترغیب و ترہیب سے۔ ہاں اس کا موضوع ہونا بیان کر دیا جائے تو اس کی اجازت ہے اور ایسے ہی اسے تقلیداً بیان کرنا اور نقل کرنا بھی

حرام ہے سوائے اس کے کہ موضوع ہونے کی صراحت کردی جائے برخلاف حدیث ضعیف کے کہ اس میں غیر احکامی روایات میں تساہل جائز ہے اور انھیں چند شرائط کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔[۴۲]

ضعیف حدیث کی روایت اور اس پر عمل

فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کی روایت اور اس پر عمل کے سلسلے میں محدثین کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک طبقہ اس کی روایت اور اس پر عمل کے سخت خلاف ہے لیکن ایک دوسرا طبقہ جس میں عام فقہا اور محدثین شامل ہیں انھوں نے اس کی روایت اور اس پر عمل کی اجازت دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط رکھی ہے کہ ان پر عمل کرتے وقت یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ضعیف حدیث پر عمل کی تین شرطیں بیان کی ہیں۔

(۱) حدیث کا ضعف شدید نہ ہو یعنی اس کے راویوں میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور نہ فاش غلطی کرنے کا مرتکب ہو۔

(۲) حدیث جس مفہوم پر مشتمل ہو اس کی بنیاد موجود ہو اور اس پر عمل اسلام کے معروف اور ثابت شدہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

(۳) عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ از روئے احتیاط اس پر عمل ہو یعنی اسے اس طور پر نہ قبول کیا جائے کہ فی الواقع اس کی نسبت رسولؐ کی طرف صحیح ہے بلکہ اس بنیاد پر کہ ممکن ہے اس کی نسبت درست ہو اور اس پر عمل سے ثواب ملے گا۔[۴۳]

محدثین کے ایک دوسرے طبقہ کے نزدیک جس میں امام بخاری اور امام مسلم جیسے کبار محدثین شامل ہیں، ضعیف حدیث پر مطلق عمل جائز نہیں۔ نہ احکام شرعیہ میں اور نہ مواعظ و قصص وغیرہ میں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ان لوگوں پر سخت نکیر کی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ یا تو کتاب اللہ سے یا سنت ثابتہ سے ماخوذ ہو اس کے سوا حدیث ضعیف کی بنیاد پر کچھ کہنا دین میں ایک قسم کا اضافہ ہے اس لیے

کہ ضعیف حدیث کا شمار سنت ثابتہ میں نہیں ہوتا۔ اس پر عمل سے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کا بھی خطرہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل ۳۶)

ان چیزوں کے پیچھے مت پڑو جن کا تمہیں علم نہیں۔

اس لیے ضعیف حدیث جب تک مختلف طرق سے مروی نہ ہو اور وہ درجۂ حسن تک نہ پہونچ جائے اس کی روایت جائز نہیں اور اس کا قبول کرنا فاسقوں اور بداحتیاط لوگوں کے اقوال قبول کرلینے کے مشابہ ہے[۷۴]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث بیان کرنے اور اسے قبول کرنے میں غایت درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی ایسی روایت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردینا جس کی نسبت آپ کی طرف ثابت نہ ہو ہرگز درست نہیں۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی بات کتاب اللہ یا سنت ثابتہ میں سے سامنے نہ ہو تو اسے اپنی طرف سے بیان کرے تاکہ اگر کوئی غلطی ہو تو اس کی طرف منسوب ہو جائے، بجائے اس کے کہ اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو۔ بلا تحقیق ہر رطب و یابس کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا چاہے وہ دین کے کاموں کے لیے کیوں نہ ہو سخت ترین گناہ ہے چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے آپ نے فرمایا:

كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع[۷۵]

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کردے۔

اسی طرح دین کے معاملے میں ہر سنی ہوئی بات کو قبول کرلینا بھی درست نہیں۔ چنانچہ ابن سیرین نے فرمایا۔

ان هذا العلم دين فانظروا عمن تاخذون دينكم[۷۶]

یہ علم (حدیث) دین ہے اس لیے دیکھو اسے کس سے قبول کر رہے ہو۔

اس لیے جہاں ایک طرف حدیث نقل کرنے اور بیان کرنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نقل و بیان سے پہلے اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیں وہیں دوسری طرف اسے قبول کرنے والوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اسے اپنے فکر و عمل کی بنیاد بنانے سے پہلے اس کی تحقیق کرلیں۔ خاص طور پر فضائل اعمال سے متعلق روایات

جن میں اکثر و بیشتر نہ صرف ضعیف ہیں بلکہ ان میں بہت سی موضوع بھی ہیں، بلا تحقیق حدیث کے نام پر ہر چیز کو قبول کر لینے اور اسے اپنے فکر و عمل کی بنیاد بنا لینے والا اندھیری رات میں جنگل میں لکڑیاں چننے والے کے مانند ہے جو لکڑی اور سانپ میں تمیز نہ کر سکنے کی وجہ سے سانپ کو اٹھا لیتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیتا ہے۔

حوالے/حواشی

۱ ابن صلاح، مقدمہ/۲۱۲، مصر، ۱۹۷۴ء

۲ ابن حبان البستی، کتاب المجروحین/۵۶، حیدرآباد ۱۹۷۰ء۔ مسلم، مقدمہ، باب بیان الاسناد

۳ جلال الدین سیوطی، اللآلی المصنوعہ/۵۹۷، مطبع علوی (ہند) ۱۳۰۳ھ

۴ ایضاً ۵ کتاب المجروحین ۱/۵۴

۶ جلال الدین سیوطی، تدریب الراوی ۱/۲۸۲، لاہور (پاکستان) ۱۳۷۹ھ، مقدمہ ابن صلاح/۲۱۴

۷ شمس الدین محمد السخاوی، فتح المغیث/۱۱۰، مطبع انوار محمدی ۱۳۰۳ھ

۸ اللآلی المصنوعہ/۵۹۷

۹ ایضاً/۱۳۷، ابن عراق، تذکرۃ الموضوعات/۱۳۱ مخطوط مولانا آزاد لائبریری، عبدالحئی فرنگی محلی کلکشن ۱۳۳/۹۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)

۱۰ محمد طاہر الفتنی، تذکرۃ الموضوعات/۷۸ بمبئی ۱۳۴۳ھ

۱۱ ایضاً، تذکرۃ الموضوعات (مخطوط)/۳۸، ابن جوزی، العلل المتناہیہ/۲۶، مخطوط مولانا آزاد لائبریری، عبدالحئی فرنگی محلی کلکشن ۱۳۴/۹۳ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۲ ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل فاتحۃ الکتاب

۱۳ بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب سورۃ البقرہ، مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قرأۃ القرآن وسورۃ البقرہ، ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ البقرہ وآیۃ الکرسی، ابن ماجہ، باب ماجاء فیما یرجی ان یکفی من قیام اللیل۔

۱۴ ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ البقرہ وآیۃ الکرسی، مسلم، کتاب فضائل القرآن باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی۔ مسلم میں آیۃ الکرسی کو اعظم آیۃ من کتاب اللہ کہا گیا ہے۔

۱۵ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب قرأۃ القرآن وسورۃ البقرہ۔

۱۶؎ ایضاً باب فضل الفاتحہ وخواتیم سورۃ البقرہ

۱۷؎ ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ البقرہ وآیۃ الکرسی

۱۸؎ بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ البقرہ

۱۹؎ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی۔ ترمذی میں ہے" من قرأ ثلاث آیات من اوّل الکہف عُصم من فتنۃ الدجال" باب ماجاء فی سورۃ الکہف

۲۰؎ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قل ہواللہ احد، بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قل ہواللہ احد۔

۲۱؎ مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءۃ المعوذتین، ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی المعوذتین۔

۲۲؎ بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی المعوذتین

۲۳؎ ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی اذا زلزلت۔ امام ترمذی نے کہا ہے۔ ھٰذا حدیث غریب لا نعرفہ الا من حدیث ھٰذا الشیخ الحسن بن سلم، حسن بن سلم مجہول راوی ہیں۔ یہ روایت دوسری سند سے بھی مروی ہے لیکن اس کی بھی سند کمزور ہے۔ اس میں ایک راوی یمان بن مغیرہ ہیں۔ امام بخاری اور ابوحاتم نے کہا کہ یہ منکر الحدیث ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع ترمذی عبدالرحمٰن مبارکپوری، ابواب فضائل القرآن باب ماجاء فی اذا زلزلت) اسی کے ہم معنی ایک تیسری روایت بھی امام ترمذی نے نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔

۲۴؎ ایضاً۔ قل یاایہا الکٰفرون اور سورہ زلزال دونوں کی سند ایک ہی ہے اس لیے جو حکم سورہ زلزال کا ہے وہی اس سورۃ کا ہے۔ دیکھئے حاشیہ نمبر ۲۳

۲۵؎ ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ الملک۔ قال الترمذی۔ ہٰذا حدیث غریب من ہذا الوجہ، مزید برآں یہ کہ اس سند میں ایک راوی یحییٰ بن عمرو بن مالک ہیں جو ضعیف ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی، ابواب فضائل القرآن باب ماجاء فی سورۃ الملک۔

۲۶؎ ایضاً۔ قال ترمذی۔ ہٰذا حدیث حسن

۲۷؎ ابن قیم، المنار المنیف /۱۱۳، بیروت ۱۹۷۰ء

۲۸؎ اللآلی المصنوعہ /۳۳۴

۲۹؎ المنار المنیف /۹۸، تذکرۃ الموضوعات /۴۵
۳۲۳

۳۰؎ ابن ماجہ، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۱؎ ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۲؎ العلل المتناہیہ/۱۴۲
۳۳؎ ابن ماجہ، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۴؎ مسند احمد ۲/۱۷۶، مصر ۱۳۱۳ھ (ترجمہ عبداللہ بن عمرو)
۳۵؎ العلل المتناہیہ/۱۴۴
۳۶؎ ابوزہرہ، ابن حنبل/۲۷، قاہرہ ۱۹۶۳ء العلل المتناہیہ/۱۴۴، تحفۃ الاحوذی، ابواب الصوم باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۷؎ تحفۃ الاحوذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۸؎ ابن ماجہ، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان
۳۹؎ تحفۃ الاحوذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی لیلۃ النصف من شعبان، احمد عبدالرحمٰن البنا، بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی ۱۰/۲۰۹، مصر ۱۳۵۷ھ
۴۰؎ عبدالحیٔ لکھنوی، الآثار المرفوعۃ/۳۰۲، ۳۰۰، المطبع الیوسفی، لکھنؤ (ب ت)
۴۱؎ نسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النہار، باب فی احیاء اللیل
۴۲؎ اللآلی المصنوعہ/۳۶۷
۴۳؎ تذکرۃ الموضوعات/۱۱۸
۴۴؎ المنار المنیف/۱۱۲
۴۵؎ تذکرۃ الموضوعات/۱۱۹
۴۶؎ علی القاری، موضوعات کبیر/۵۶۱، قرآن محل، کراچی (ب ت) المنار المنیف/۱۱۱
۴۷؎ الآثار المرفوعۃ/۳۲۰
۴۸؎ ابن ماجہ، ابواب ماجاء فی الصیام، باب صیام یوم عاشوراء
۴۹؎ ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الحث علی صوم یوم عاشوراء
۵۰؎ مسلم، کتاب الصیام، باب فضل صوم المحرم
۵۱؎ مسند احمد ۱/۲۲۱ (ترجمہ عبداللہ بن عباس)
۵۲؎ الآثار المرفوعۃ/۳۳۱

۵۳ موضوعات کبیر/۵۶

۵۴ تذکرۃ الموضوعات/۱۱۶ (مخطوط)

۵۵ ابن حجر، تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب/۲۰، مخطوط، مولانا آزاد لائبریری، عبدالحئی فرنگی محلی کلکشن $\frac{۲۳۰}{۱۸۹}$، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۵۶ اللآلی المصنوعہ/۲۳۲، تبیین العجب/۲۳۵

۵۷ ایضاً، تذکرۃ الموضوعات/۲۴

۵۸ المنار المنیف/۹۵ ۵۹ ایضاً/۹۶

۶۰ اللآلی المصنوعہ/۳۲۷، العلل المتناہیہ/۱۰۷، تذکرۃ الموضوعات/۲۶۶ (مخطوط)

۶۱ المنار المنیف/۹۵

۶۲ الآثار المرفوعہ/۳۱۶، ۳۱۸

۶۳ اللآلی المصنوعہ/۵۹۶

۶۴ المنار المنیف/۱۱۵، مقدمہ ابن صلاح/۲۱۵

۶۵ خطیب بغدادی، کتاب الکفایہ فی علم الروایۃ/۲۱۱، حیدرآباد ۱۹۷۱ء

۶۶ ابن عبدالبر، الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء/۱۶، مصر، ۱۳۵۰ھ

۶۷ فتح المغیث/۱۲۰

۶۸ ابن حجر، القول المسدد فی الذب عن المسند للامام احمد/۱۳، حیدرآباد ۱۹۶۶ء

۶۹ فتح المغیث/۱۲۰، حافظ ابن صلاح نے فرمایا کہ محدثین ان ابواب میں ضعیف حدیث کے ضعف کو بھی نہیں بیان کرتے تھے۔ مقدمہ ابن صلاح/۲۱۷

۷۰ فتح المغیث/۱۱۴، تدریب الراوی ۱/۲۷۶

۷۱ بخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم،

۷۲ الآثار المرفوعہ/۲۵۴ - مزید دیکھئے شرح النووی لمسلم، مقدمہ، باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۷۳ ابن حنبل/۲۷۶ ۷۴ ابن حنبل/۲۷۰، مسلم مقدمہ

۷۵ مسلم، مقدمہ، باب النہی عن الحدیث بکل ما سمع

۷۶ مسلم، مقدمہ، باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء

سیر و سوانح

خرم جاہ مراد

ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی

خرم جاہ مراد مرحوم، نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان ۱۹۳۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے تھے ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی یونیورسٹی نیز مینی سوٹا یونیورسٹی (امریکہ) میں انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بطور انجینیر وہ کراچی، ڈھاکہ، طہران اور ریاض میں مقیم رہے۔ ریاض میں قیام کے دوران مرحوم نے حرم پاک کی توسیع میں نمایاں حصہ لیا۔ مرحوم بچپن ہی سے تحریک اسلامی سے وابستہ تھے جماعت اسلامی بھوپال سے تعلق کی بنا پر انھوں نے جمعیۃ الطلبہ کی رکنیت اختیار کی اور ۱۹۵۱-۵۲ء میں اس کے ناظم اعلیٰ رہے۔ اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان میں شامل ہوگئے۔ مرحوم ڈھاکہ اور لاہور کے امیر، جماعت کی مجلس عاملہ اور مرکزی مجلس شوریٰ کے اہم رکن بھی رہے۔ ۱۹۸۷ء سے اپنی وفات تک وہ نائب امیر کے منصب پر مامور رہے۔ ۱۹۹۲ء سے وہ مولانا مودودیؒ کے قائم کردہ مجلّے 'ترجمان القرآن' کے مدیر کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ ان کے زیر ادارت "ترجمان" کے معیار اور خریداروں کے حلقوں میں نمایاں اضافہ ہوا۔ مرحوم ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر (انگلستان) کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہے۔ انگریزی اور اردو میں مرحوم کی تصانیف کی تعداد تیس سے زائد ہے۔ مولانا مودودی کی متعدد تصانیف کے انگریزی ترجمے کے علاوہ مرحوم نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک انگریزی تصنیف کو بھی مدوّن اور مرتب کیا۔ مرحوم کی وفات ۱۹ دسمبر ۱۹۹۶ء کو لیسٹر انگلستان میں بعارضۂ قلب ہوئی۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

مندرجہ ذیل تاثراتی مضمون ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی کے قلم سے ہے۔ موصوف کو خرم جاہ مراد مرحوم سے رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔

(ادارہ)

کچھ دل آویز شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے ذہنی مناسبت، قلبی تعلق اور جذباتی لگاؤ کے وفور کے باعث یہ متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان سے رسمی تعارف کب ہوا؟ دراصل قلبی یگانگت اور مناسبت مہ و سال کے قیود سے بے نیاز بلکہ ماورا ہوتی ہے۔

حافظے کی لوح پر خرم جاہ مراد مرحوم کا اولین اور انتہائی خوشگوار اور مرعوب کن نقش اسلامک فاؤنڈیشن انگلستان کے معیاری انگریزی علمی مجلے 'مسلم ورلڈ بک ریویو' کے مدیر کے طور پر مرتسم ہے۔ مجلے کے اسی شمارے میں مرحوم کے قلم سے دورِ حاضر کے متجدد ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی قرآن مجید پر تصنیف کا بلند پایہ علمی محاسبہ بھی شامل تھا۔ بحیثیت مدیر اور مصنف مرحوم نے قلب و ذہن کو منور اور مرتعش کر دیا۔ حسن اتفاق کہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول اور اسلامک فاؤنڈیشن کے انگریزی تراجم کے پراجیکٹ کے ضمن میں راقم السطور کا عرصے تک انگلستان میں قیام رہا اور مرحوم کی سیرت اور علمیت کئی پہلوؤں سے تسخیرِ قلب کا باعث بنتے چلے گئے۔ یہاں ذکر ان کی شخصیت کے معروف اور رسمی گوشوں کا نہیں بلکہ پیشِ نظر یہ ہے کہ مرحوم کے فکر و فن کی ایسی جہات کو نمایاں کیا جائے جو مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

تعلیمی اسناد اور پیشے کی رو سے مرحوم انجینیر تھے، اس فن میں بھی وہ درجۂ کمال پر فائز تھے لیکن اہم تر نکتہ یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی تعمیر سے عبارت رہی۔ تعمیرِ کردار کی۔ تعمیر اداروں کی، تعمیرِ ذہن کی اور تعمیرِ جماعت کی۔ اور اس ساری تعمیری سرگرمی کا نقشہ صرف ایک تھا ــــ اسلام ــــ مرحوم نے اپنی بہترین صلاحیتیں اپنے گرد و پیش کے افراد اور معاشرے کو اسلامی خدوخال میں ڈھالنے کے لیے وقف کر دی تھیں۔ یہ بھی غالباً ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا فیضان تھا کہ ہر منصوبہ انتہائی دور رسی کے ساتھ مرتب کرتے اور نہایت سلیقے سے اسے بروئے عمل لاتے۔ یقیناً ان کے ذہن کی تعمیری جہت کو یہ ارفع مقصدیت، مولانا مودودیؒ سے ان کے علمی اور فکری استفادے، جماعت اسلامی اور جمعیۃ الطلبہ سے گہرے تعلق کی بدولت میسر آئی۔ البتہ قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس تعمیری صلاحیت کو دیارِ مغرب میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص اسلام کی بنیادیں مضبوط کرنے، اس کے علمی اور فکری قلعوں کو کھڑا کرنے اور اُس کی دفاعی فصیلوں کو مستحکم کرنے میں صرف کیا ــــ طارق بن زیاد اور عبدالرحمٰن الداخل کے خواب کی

بیسویں صدی کے آخر میں کیسی زریں تعبیر تھی یہ۔

مرحوم کا ذہن بھی تعمیری تھا اور فکر بھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی انگریزی تفسیر کے مابہ الامتیاز خصائص پر راقم السطور کا مقالہ پاکستان کے ہمدرد اسلامکس میں شائع ہوا۔ مرحوم کی علم نوازی اور قدر افزائی الطاف نامے کی شکل میں باعث سرفرازی ہوئی۔ شفقت اور ہمت افزائی کا یہ انداز ہی مجھ نوآموز کا دل جیتنے کے لیے کافی تھا مگر جس ادا نے مجھے گویا مسخر کرلیا وہ مرحوم کا مولانا دریابادیؒ کی انگریزی تفسیر سے اپنی خوشہ چینی کا برملا اعتراف اور ان کے تفسیری کارنامے کی مدح وتحسین تھا۔ اس اجمال کا یہ پس منظر یقیناً قابل ذکر ہے کہ "صدق" مجسّم مولانا دریابادیؒ، مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی گراں قدر خدمات کے علی الاعلان معترف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تسامحات اور تفردات کے سخت ناقد بھی تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ براہِ راست خرم مراد مرحوم بھی کبھی مولانا دریابادیؒ کے قلم کی زد میں آئے ہوں۔ اس کے باوصف علمی دیانت اور امانت کے درخشاں اسلامی اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے مرحوم نے مولانا دریابادی کی تعریف اور تحسین میں کسی جماعتی عصبیت کو حائل نہیں ہونے دیا۔ عالی ظرفی کی ایسی روشن مثالیں دینی جماعتوں، اداروں اور حلقوں میں شاذ ہی ملتی ہیں۔

قیام انگلستان کے دوران مرحوم تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ دیارِ مغرب میں اسلام کی اشاعت میں منہمک رہے۔ کلمۂ حق کی سربلندی اور اسلام کی نصرت اور دفاع کے ذوق وشوق سے سرشار جذبے کے ساتھ ساتھ مرحوم پر یہ بنیادی حقیقت روشن تھی کہ مغرب میں اسلام کے مؤثر تعارف کی لازمی شرط انگریزی محاورۂ زبان پر قدرت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے انگریزی زبان اور بیان پر باقاعدہ ریاضت کرکے قابل رشک حد تک عبور حاصل کرلیا تھا۔ ان کی تصانیف کی اثرآفرینی کا ایک بڑا سبب زبان پر ان کی غیرمعمولی قدرت بھی ہے۔ اس باب میں وہ اس حد تک درجۂ کمال پر فائز تھے کہ مغربی قارئین کے جدا جدا طبقوں کے لیے مناسب اور مختلف اسالیب میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر بھی قادر تھے۔

انگلستان میں اپنے قیام کے ابتدا ہی میں ان پر یہ نکتہ واضح ہوگیا تھا کہ مغرب میں مقیم لاکھوں معاشی مہاجر مسلمانوں اور نومسلموں کی آئندہ نسلوں کی اسلامی تعلیم اور

تربیت کے لیے حسب حال کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مقصد ان کے ذہن پر ایسا مستولی ہوا کہ انھوں نے خود بچوں کے لیے مناسب تصانیف پیش کرنے کی شدید مشق بہم پہنچائی اور اس مقصد میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس حقیقت کا اظہار غالباً غیر ضروری سا ہے کہ کسی مصنف کے لیے بیک وقت علمی اسلوب اور بچوں کے لیے مناسب اسلوب پر ید طولیٰ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن مرحوم کے دل میں اسلام کی سربلندی اس کے فروغ اور اشاعت کی ایسی دھن اور ایسی تڑپ تھی کہ اس راہ میں درپیش تمام شدائد ان کے لیے ہیچ تھے۔

مرحوم کی تعمیری ادارہ سازی کا ایک بڑا ہی دلکش مظہر ان کا قائم کردہ علمی انگریزی مجلہ "مسلم ورلڈ بک ریویو" ہے جو ۱۹۸۰ء سے انتہائی پابندی سے سہ ماہی رسالے کے طور پر اب تک شائع ہو رہا ہے۔ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا ماتم ہر پڑھے لکھے مسلمان کی زبان سے سن لیجئے لیکن اس کی تردید کی سنجیدہ کوشش کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ مرحوم نے اس مجلے کے ذریعہ مستشرقین کے تعصبات، مغالطوں، ذہنی تحفظات کی پردہ دری اور ہر مسئلے پر اسلامی موقف کی پر اعتماد وکالت اور مغرب ہی کے اسلوب اور طرز بیان میں اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح اور ترجمانی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس مجلے کے ہر شمارے میں ممتاز مغربی ناشروں اور دانش گاہوں کی اسلام اور مسلمانوں پر انگریزی میں مطبوعات پر سیر حاصل اور پر مغز تبصرہ ہوتا ہے۔ اس مجلے کی علمی ساکھ کا یہ عالم ہے کہ ان موافقانہ تبصروں کو غیر مسلم ناشر اپنے حق میں اعلیٰ ترین سند گردانتے ہیں اور کتاب کے اگلے ایڈیشن کے سرورق پر بصد افتخار اسے درج کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اس مجلے کا خوشگوار اور مثبت نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب کچھ عرصہ سے بعض ناشر اپنے مسودے فاؤنڈیشن کو طباعت سے قبل روانہ کر دیتے ہیں تاکہ اسلام سے متعلق کوئی مضحکہ خیز غلطی یا دانستہ غلط بیانی اشاعت میں نہ در آئے۔ متنوع موضوعات پر تبصرہ کا حق ادا کرنا کسی فرد واحد کے لیے ممکن نہیں۔ مرحوم نے اس مقصد کے حصول کے لیے عالم اسلام کے منتخب اہل قلم کا تعاون حاصل کیا اس میں کچھ کیفیت اپنے فرض منصبی سے سرشار ایسے معمار کی نظر آتی تھی جو عمارت میں مستعمل ہر ہر خشت کا بغائر انتخاب کرتا ہو۔

اسلام کی اشاعت سے مرحوم کا تعلق نری تصنیفی سرگرمیوں تک محدود نہ تھا۔

ان کی تو گویا پوری زندگی اور تمام صلاحیتیں اسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے وقف تھیں۔ تربیت سازی اور نئی نسلوں کی ساخت و پرداخت صحیح معنی میں کارِ نبوت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جانکاہ کاوش اور دیدہ ریزی ہی درکار نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ سیرت بھی مطلوب ہوتی ہے۔ تصانیف کے ذریعہ اسلام کے تعارف کی اہمیت اور افادیت مسلّم مگر اسلام کا بہترین تعارف گوشت پوست کے قالب میں مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ مرحوم اس حقیقت کے رمز شناس تھے۔ اپنے انگلستان کے قیام کی ابتدا ہی سے مرحوم نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور بھرپور توانائی مسلم نوجوانوں کی دعوت اور تربیت پر مرتکز کر دیں۔ آج کے مادی دور میں اسلام کی جانب دعوت دینا ہی کارے دارد ہے اور پھر جب مخاطبین جنت شداد کے مکین ہوں، طاغوت کے عین قلب میں واقع قلعے میں اسیر ہوں، قدم قدم پر ترغیبات اور تحریصات کا شکار ہوں، نفسانیت بلکہ حیوانیت کے خوگر ہوں تو ان کو اسلام کے پیغام کی جانب راغب کر دینا اور ان نوجوانوں کی قلب ماہیت کر دینا اگر براہِ راست ان آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اس محیر العقول کارنامے پر یقین کسی طرح نہیں کرتا۔ مرحوم نے بڑی جانفشانی کے ساتھ صالح نوجوانوں کا ایک ہراول دستہ تیار کیا۔ سنت ابراہیمی پر عمل کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے بیٹے برادر عزیز القدر فاروق مراد سلمہ کو پیش کیا۔ ان کے انہماک، فرط تعلق، دل سوزی اور دردمندی سے ذہن میں بے اختیار ایک ایسے فرض شناس مالی کی تصویر ابھرتی ہے جو بڑی ہی سنگلاخ اور شوریدہ زمین میں لہلہاتے ہوئے چمن کا خواب دیکھ رہا ہو۔ بحمد اللہ کلمہ طیبہ کا یہ شجرہ طیبہ ینگ مسلمز کی جماعت کی شکل میں پورے انگلستان بلکہ اب یوروپ میں بھی برگ و بار لا رہا ہے۔

مرحوم عصری ضروریات سے خوب آگاہ تھے اور اسی مناسبت سے ادارہ سازی کے قائل تھے۔ اسلامک فاؤنڈیشن نامی ادارہ ان کی بصیرت اور دوررسی کا شاہکار ہے۔ دیارِ مغرب میں اسلام کی دعوت کی کیا ترجیحات ہوں؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہوں؟ اس کے لیے کن مطبوعات کی ضرورت ہوگی؟ اس کے مطالبات ہر ہر سطح پر کیا ہوں گے؟ اس ہمہ گیر مشن کے نفاذ کے لیے کیسے افراد مطلوب ہیں؟ مرحوم کا ذہن ان سوالات کی بابت بے غبار حد تک صاف تھا۔ ۱۹۸۰ء میں فاؤنڈیشن کی

قیادت قبول کرنے کے بعد مرحوم نے اسے مغربی معیارات کے مطابق ایک اعلیٰ پایہ کے علمی، دعوتی اور اشاعتی ادارے کے فروغ کا جو منصوبہ مرتب کیا تھا آج فاؤنڈیشن اپنی توسیع اور استحکام کے لیے مرحوم کی روشن فکر کا مرہون منت ہے۔ مرحوم نے فاؤنڈیشن میں بعض ایسے شعبوں کی بنیاد ڈالی جن کی اہمیت اور افادیت کا کما حقہٗ ادراک اب تک پوری طرح عالم اسلام میں نہیں ہے۔ مثلاً آج کی بین المذاہبی دنیا میں اجتماعی زندگی کا ایک اہم گوشہ مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے متبعین کے مابین تعلقات اور ان کی نوعیت کا ہے۔ تعلقات سے مراد دینی تعلقات بھی ہیں اور معاشرتی بھی۔ مغرب کی ضروریات کے پیش نظر مرحوم نے فاؤنڈیشن میں عیسائی مسلم تعلقات کا شعبہ قائم کیا۔ یہی معاملہ کم و بیش انگریز نومسلموں کا بھی ہے۔ ان کی علمی اور معاشرتی ضرورتیں قبول اسلام کے بعد عام مسلمانوں سے قدرۃً مختلف ہوتی ہیں۔ مرحوم نے بروقت اس کا اندازہ کیا اور فاؤنڈیشن کا ایک سرگرم شعبہ بحمداللہ اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلام کی حقانیت کو منظر عام پر لانے کے لیے جامع اسلامی طرز حیات کا تعارف ناگزیر ہے۔ فاؤنڈیشن نے مغربی دنیا کو اسلامی معاشیاتی نظام کے مالہٗ اور ماعلیہ سے اس درجہ واقف کرا دیا کہ اب متعدد برطانوی دانش گاہوں میں اسلامی معاشیات بطور اہم مضمون مروج ہے۔ دیارِ مغرب میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے مسلم نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ مرحوم کی قیادت میں فاؤنڈیشن نے اس میدان میں اولیت کا شرف حاصل کیا۔ گراں قدر اسلامی مطبوعات، تربیتی کیمپوں کا انعقاد وغیرہ اسی بصیرت افروز فکر کے نتیجے کے طور پر منظر عام پر آئے۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق دستاویزی مواد کی فراہمی، اس کی موضوعاتی درجہ بندی اور اس کے تجزیاتی مطالعوں کے لیے بھی مرحوم نے فاؤنڈیشن میں خاصا اہتمام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دیارِ مغرب میں اسلام کی ترقی اور اشاعت کے معروف طریقوں یعنی مساجد، مکاتب اور لائبریریوں کے قیام اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مذاکرات کے ذریعے اسلام کی صحیح تصویر کشی جیسے امور کو مرحوم نے نظر انداز نہ کیا البتہ ان کے تعمیری ذہن کا اصل کارنامہ دیارِ مغرب میں اسلام کی بنیادوں کو پختہ کرنے، اس میں حسب حال اضافے کرنے اور اس کے رخنوں اور انہدام کا سدباب کرنے میں مضمر ہے۔ مرحوم کا یہ کارنامہ صدقۂ جاریہ

کی بہترین مثال اور خیر کثیر کی قابل رشک علمی شکل ہے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے (آمین) اس صراحت میں چنداں مضائقہ نہیں کہ فاؤنڈیشن کے ان بیش بہا کارناموں میں بڑا دخل مرحوم اور فاؤنڈیشن کے بانی اور چیرمین پروفیسر خورشید احمد کے درمیان ذہنی یگانگت اور اشتراک عمل کا بھی تھا جو اس وقت تک جاری رہا۔ یہ پروفیسر احمد کی جوہر شناس نظر اور رساذہن کا کمال تھا کہ اس بیش قیمت تعمیری کام کے لیے مرحوم کا انتخاب کیا۔ اسی طرح فاؤنڈیشن کے ان منصوبوں کو حقیقی رنگ و روغن عطا کرنے میں اہم پہلو اس بیش بہا تعاون کا بھی تھا جو مرحوم کو بربنائے اخلاص اور برادرانہ محبت اپنے رفقاء ڈاکٹر محمد مناظر احسن اور سید فیاض الدین احمد سے ہمیشہ حاصل رہا۔

مرحوم خرم مراد نے انگریزی زبان میں متعدد علمی اور وقیع کتابیں تصنیف کی ہیں یا ان کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور فروری ۱۹۷۷ء میں ان کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ذیل کی سطور میں ان کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے:

۱۔ Way to the Qura'n: اس کتاب میں بڑے سادہ لیکن دلکش اور موثر انداز میں اللہ کے بندوں کو قرآن سے جوڑنے اور انھیں قرآن کے پیغام کو سمجھنے کا راستہ دکھایا گیا ہے اور اس کی تلاوت، تفہیم، تعلیم اور تنفیذ ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۲۔ Shariah: The way to God
۳۔ Shariah: The way to Justice
مذکورہ دونوں مضامین میں قرآن کے پیش کردہ نظام زندگی کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۴۔ A Quranic Treasure: یہ قرآن کے پیغام پر مشتمل انتخاب ہے۔

۵۔ Major Themes in Quran: یہ کتاب یونیسکو کے ایک علمی پروجیکٹ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس میں قرآن کے مضامین اور اسالیب سے بحث کی گئی ہے۔

۶۔ Key to Al-Baqarah: اس میں سورۂ البقرہ کے مضامین کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس کے اندرونی نظم کو واضح کیا گیا ہے۔

۷۔ Gifts from Mohammad
۸۔ Who is Mohammad?
ان میں سیرت نبوی اور تعلیمات نبوی کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۹۔ Islamic Movement in the west: Reflections on some issues (1981)

۱۰۔ Dawah among non-muslims in the west. Some Conceptual and methodological aspects (1986)

ان دونوں کتابوں میں مغرب میں اسلامی دعوت کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تحریک اسلامی کے اہداف اور ترجیحات متعین کی گئی ہیں۔

۱۱۔ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر کے تحت بچوں اور نوجوانوں کے لیے اسلامی ادب پر تقریباً ایک درجن کتابیں تیار کیں۔

۱۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی متعدد تصانیف کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مثلاً اسلام کا نظامِ حیات، کا پروفیسر خورشید احمد کے ساتھ مل کر Islamic way of life کے نام سے ترجمہ کیا۔ خطبات کا ترجمہ Let us be Muslims کے نام سے کیا۔ اسی طرح "شہادتِ حق" اور "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ان پر تعارف لکھا اور وضاحتی نوٹ لگائے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی ان خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور مغرب میں اسلام کی اشاعت کی، مرحوم کی کاوشوں کو استحکام بخشے۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم پیش کش

مذہب کا اسلامی تصوّر مولانا سلطان احمد اصلاحی

اس کتاب میں معاملات دنیا سے مذہب کی بے دخلی کے تصور کو اس کے خاص تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چرچ کے ناقابل بیان مظالم کے نتیجے میں یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علاحدگی اور مسیحیت سے بے زاری کے ساتھ خود مذہب سے بے زاری پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے باب میں قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلام کے مطلوبہ تصور مذہب کو پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت، صفحات ۵۹۱، قیمت مجلد صرف ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے: (۱) ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳۔ چتلی قبر۔ دہلی۔ ۶

سیاسیاتِ عالم

اسلام کے سیاسی فکر کی تشکیلِ جدید

(مولانا سید سلیمان ندوی اور معاصرین کے افکار کا مطالعہ)

ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) ایک متبحر عالم دین، ایک مایہ ناز مورخ، ایک صاحب بصیرت مفکر اور بلند خیال ادیب تھے۔ آپ کی ممتاز خدمات کا دائرہ تاریخ وسیرت، ادب وتنقید، قرآن وفقہ، لسانیات وصحافت اور سلوک ومعرفت کے متنوع پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی علمی واصلاحی زندگی میں سیاست اور سیاسی سرگرمیوں کو کوئی منفرد مقام حاصل نہ تھا مگر ہندوستانی وملی سیاست کے جن مسائل پر آپ نے اظہار خیال کیا اور جن تحریکوں اور مہمات میں آپ کی جدوجہد شامل رہی انھیں کوئی سیاسی مورخ نظرانداز نہیں کرسکتا۔

۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک تحریک خلافت کے روح رواں کی حیثیت سے مولانا نے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرفروشانہ مجاہدہ کیا، انگریزی استعمار کے خلاف قومی رہنماؤں کے دوش بدوش مصروفِ عمل رہے بلکہ ایک مذہبی اور دینی فریضہ کی حیثیت سے ادارۂ خلافت کے احیاء، اس سے متعلق اعتراضات اور شکوک وشبہات کے ازالہ اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے اثبات کی جدوجہد کی۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۰ء کو تحریک خلافت کا جو وفد وائسرائے ہند سے اپنے مطالبات پیش کرنے کے لیے ملا اس میں مولانا شریک تھے پھر ۲۰ر مارچ ۱۹۲۰ء کو ایک وفد حکومت برطانیہ کے سامنے اپنے مطالبات براہ راست رکھنے کے لیے لندن پہونچا اس میں اس مسئلہ کی دینی ترجمانی کے لیے مولانا ہی کا انتخاب ہوا[۱] خلافت کمیٹی نے ۲۰ر اپریل ۱۹۲۴ء کو ایک وفد جزیرۃ العرب بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کی قیادت کے لیے مولانا ہی کا نام تجویز ہوا۔ اس وفد کو مندرجہ ذیل ہدایات کے ساتھ روانہ کیا گیا۔

(۱) مسلمانان ہند کی خواہش ہے کہ حجاز میں شرعِ اسلامی کے اصولوں پر جمہوری حکومت قائم ہو جس میں حجاز اندرونی طور پر آزاد و خود مختار ہو اور مسلمانان عالم سے متعلق مسائل میں اسلامی مرکزی حیثیت میں وہ عالم اسلام سے بھی مشورہ کرے۔
(۲) ایک اسلامی مؤتمر کی تشکیل ہو جس میں تمام اسلامی حکومتوں کے نمائندے شامل ہوں۔
(۳) حجاز کی جمہوریت اور مرکزی حکومت سے شریف حسین کا کوئی تعلق نہ ہو۔
(۴) تمام عرب ریاستوں میں شرع اسلامی کے مطابق کامل اتحاد ہو۔ وغیرہ[۲]

۲۰ اپریل ۱۹۲۶ء کو خلافت کمیٹی نے چوتھا وفد مؤتمر میں شرکت کی غرض سے جزیرۃ العرب بھیجا جس کے اراکین میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور محمد شعیب قریشی تھے۔ اس کے صدر مولانا سلیمان ندوی منتخب ہوئے۔ سلطان عبدالعزیز بن سعود سے اس کمیٹی نے چار بار ملاقات کی اور ہر ملاقات میں مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر بیان کیا اور شرع اسلامی کی روشنی میں اس کی وضاحت کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریک خلافت کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا۔ ۱۹۲۱ء کے اجلاس احمد آباد میں وہ شریک ہوئے اور مجلس عاملہ کے رکن منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں وہ شریک رہے۔ ملک کی آزادی کے حصول کے لیے کانگریس کے ساتھ اشتراک و تعاون کے پس پردہ ان کا یہ نقطہ نظر کارفرما تھا کہ :

> "اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالف انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذر آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی طاقت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انہی پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لیے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے۔"[۳]

مولانا نے ہو سکتا ہے مسلمانوں کو جوش اور غیرت دلانے کے لیے یہ بات کہی ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جد و جہد میں مسلمان تماشائی نہیں بنے رہے بلکہ اپنی آبادی کی نسبت سے اس میں برابر کے شریک رہے مولانا کے اس بیان کو پوری طرح

مان لینے کے بعد ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کی سرفروشانہ شرکت نہ ہونے کی وجہ ان کی پست ہمتی، بزدلی اور کم مائیگی تھی یا وہ اس تحریک میں آنکھیں بند کر کے شریک ہونے کے لیے تیار نہ تھے جس کی بنیاد قوم پرستی اور برطانوی طرز کی جمہوریت پر رکھی گئی تھی۔ مسلمانوں نے جب اس رخ پر سوچنا شروع کیا تو ان کے رویہ میں تبدیلی آگئی۔ اس بحث سے قطع نظر مولانا کا ذہن اس معاملہ میں بالکل یکسو تھا۔ وہ سیاسی آزادی کی اس جد وجہد کو مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ تقریباً ۶ ماہ کے سفر یورپ اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ:

"اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیے۔ اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے۔"[۴]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے علماء دین اور رہنمایان ملت کی طرح مولانا نے بھی ہندوستانی سیاست کو تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی اس وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں کی فرقہ وارانہ ذہنیت، غیر جمہوری سوچ اور فسطائی طرز فکر و عمل مولانا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد کے تیس صفحات کی نقاب کشائی اور خود گاندھی جی کے مکاتیب پر حالیہ تبصروں نے اس حقیقت کو بالکل عیاں کر دیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ سیاسی دوڑ دھوپ اور جد وجہد ان کی علمی و اصلاحی زندگی کا ایک بہت معمولی حصہ تھی اور اس شرکت و مساہمت کو وہ اپنے لیے قابل فخر تصور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ خود فرماتے ہیں:

"میں پالیٹکس سے گھبراتا نہیں اور نہ سیاست کے خطرات سے خوف زدہ ہوں لیکن قوم مجھ سے ایک ہی کام لے سکتی ہے یا علم کی خدمت یا سیاست۔ خدمتِ علم سکون و اطمینان کی طالب ہے اور سیاست ہنگامہ آرائی اور شور و غل کی مقتضی۔ جب تک دار المصنفین اور تکمیل سیرت کی زنجیر اپنے پاؤں سے نہ کاٹوں اس دنگل میں کود نہیں سکتا

ایک وقت میں دو کام نہیں ہو سکتے، بایں ہمہ آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی
اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر اس دنگل میں بھی کود جاتا ہوں۔"[۵۵]

اسلام کا تصورِ سیاست

مولانا کے سیاسی افکار پر گفتگو کرتے ہوئے ان مقالات و مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اسلام کے سیاسی فکر سے متعلق ان کے نوکِ قلم سے وجود میں آئے۔ یہ تحریریں راقم کی نگاہ میں انتہائی اہم ہیں اور سنجیدہ تجزیہ اور ماہرانہ مطالعہ کی طالب ہیں۔ اسلام کے نظامِ سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنے معاصر اور بزرگ مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۳ء — ۱۹۳۰ء) سے متاثر بھی نظر آتے ہیں اور یک گونہ اختلاف کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اسلام کے تصورِ سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے۔ آپؐ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی[۵۶]۔ مولانا کتاب اور نبوت کے بعد حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست کو اللہ کی بڑی نعمت تصور کرتے ہیں[۵۷]۔ مولانا کے مطابق "حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں یا قوانین ہیں۔ یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں۔ اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزو ہے۔"[۵۸]

دین و سیاست، مذہب و حکومت اور جہادِ اصغر و جہادِ اکبر میں تفریق کرنے والوں اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دینے والوں پر مولانا سخت تنقید کرتے ہیں:

"ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل و تدبیرِ دنیا کا کام ہے جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہیے لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں۔ اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء کے لیے ہے اور یہ عین دین ہے۔ اسلام میں جس قتال و جہاد کی

دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے
اللہ نے فرمائے ہیں..... اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا ہی تھا۔[۹]

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء — ۱۹۵۸ء) مذہب اور سیاست کے اجتماع کو "روح القدس" خیال کرتے ہیں جو مس کو طلائے خالص بنا دیتی ہے اور ناقابلوں کو جوہرِ گراں مایہ۔ اسی روح القدس کے فقدان کی وجہ سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں ترقی صفر ہے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا نہ ہونا، ہندوؤں جیسے قابل اشخاص کی ہم میں عدم موجودگی، سحر بیان مقرر اور جادو نگار اہل قلم کی کمیابی اور ایثار و فدائیت کی مثالوں کا عنقا ہونا سب اس وجہ سے ہے کہ مذہب کو اوہام و خرافات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور سیاست کو آدم کے باغِ عدن کا شجر ممنوعہ۔[۱۰]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳ء — ۱۹۷۹ء) نے دین کا جو تصور پیش کیا اس میں مذہب و سیاست کا باہمی ربط واضح ہے۔ وہ سیاست کو مذہب ہی کا ایک حصہ سمجھتے رہے۔ یہ وہ تصور دین ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجا کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔[۱۱]

خلافت کا مفہوم و مدّعا

مولانا فراہیؒ نے خلافت کا جو تصور دیا ہے اس کی بنیاد مطلق آزادی، عہد اور بیعت پر ہے۔[۱۲] وہ فرانسیسی مفکر جان جاک روسو (۱۷۱۲ء — ۱۷۷۸ء) کے معاہدۂ عمرانی (Social Contract Theory) سے متاثر نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی قرآن کے تصور عہد و میثاق کی گہری چھاپ بھی ان کی فکر پر ہے۔ مولانا نے تمدن کی ترقی اور خلافت کے قیام کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اللہ نے نوع انسانی پر اپنی کامل رحمت کا ارادہ کیا تو اس کی تربیت کے اسباب بھی فراہم کیے اور ثقافت و تمدن کو نوع انسانی کی تکمیل کا زینہ

بنایا اور وہ زینہ خلافت ہے۔[۱۳] فراہیؒ کے تصور خلافت میں انسانوں کی عظیم ترین نعمت آزادی وحریت باقی رہتی ہے اور عدل وقسط کا نظام نافذ رہتا ہے لیکن جب عوام اپنی حریت کا تحفظ نہیں کر پاتے اور عدل وقسط کی قیمت چکانے پر تیار نہیں رہتے تو ملوکیت آجاتی ہے اور اس نظام ملوکیت کا پہلا قدم امت کا حق انتخاب امیر غصب کرنا ہے۔[۱۴]

سید سلیمان ندویؒ کا تصور خلافت مادی وروحانی، دنیاوی ودینی دونوں قسم کی سرداری وسیادت پر مشتمل ہے۔[۱۵] مولانا کے مطابق خلیفہ "دینی ودنیوی، مادی وروحانی دونوں قوتوں کا بیک وقت رئیس وسردار ہے۔ کوئی روحانی خلیفہ وامام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ مادی ودنیاوی طاقت کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ میں نہ رکھتا ہو۔"[۱۶] خلافت الٰہی کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ "اس خلافت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ دین جس کو خدا نے ان کے لیے پسند کیا یعنی اسلام، اس کو دنیا میں قوت واستحکام بخشا جائے کہ ظالموں اور ستمگروں کی زبردستی کے حملوں سے وہ دین اور اس کے ماننے والے ہمیشہ محفوظ رہیں۔"[۱۷] مولانا نے سلطنت، ملک اور ملک الملوک کی باقاعدہ تشریح کی ہے اور ان کے تصور کو اسلامی قانون کی روح کے منافی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے طرز حکومت کو خلافت کا نام دینا مناسب ترین ہوگا کیونکہ یہ حکومت دراصل اللہ کی نیابت ہے اور اسلامی امیر اس کا خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔[۱۸] یہاں اس امر کی صراحت نامناسب نہ ہوگی کہ مولانا سلیمان ندوی کا تصور خلافت قدرے مبہم ہے وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے مفہوم ومعنیٰ کی وضاحت بیانیہ انداز میں کرتے ہیں جبکہ مولانا فراہی کے یہاں کسی قدر تجزیہ اور تفصیل بھی ہے۔

مولانا آزاد نے خلافت کے تصور پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن میں خلافت، استخلاف فی الارض اور وراثت وتمکن فی الارض کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مقصود زمین کی قومی عظمت وریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت وسلطنت ہے۔[۱۹] مولانا آزاد کے مطابق رسول اکرمؐ اور آپ کے خلفاء اربعہ نے جس اسلامی ریاست کی تشکیل کی تھی وہ دراصل اہل ایمان کی جمہوری خلافت تھی جس کے چھ قواعد اساسی تھے:

۱۔ سب کتاب وسنت کے احکام کے پابند تھے اور مطلق العنانی کو قطعاً دخل نہ تھا۔

۲۔ عدل اور قانون کی یکسانیت۔
۳۔ مساوات بین المسلمین۔
۴۔ امانت یعنی ذمہ داریوں کی منصفانہ تقسیم۔
۵۔ شورائی نظام۔
۶۔ اطاعت فی المعروف۔[۲۰]

مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں متعدد مواقع پر خلافت کی تشریح و توضیح کی ہے۔[۲۱] مولانا کے مطابق خلافت اور امانت دو مترادف قرآنی اصطلاحیں ہیں جن کے ذریعہ انسان کو اس کے اصل فرائض منصبی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ انسان اس سرزمین کا فرمانروا ہے مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں بلکہ تفویض کردہ ہے اس لیے قرآن نے اس کے اختیارات مفوّضہ کو امانت سے تعبیر کیا ہے۔[۲۲] مولانا مودودی کا یہ تصور خلافت انفرادی، شخصی، طبقاتی یا خاندانی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یہاں اقتدار کسی ایک شخص، طبقہ، خاندان کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے اور یہ اقتدار بھی محدود ہے کیونکہ یہ خدا کا عطیہ ہے اور اسے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔[۲۳]

اقتدارِ اعلیٰ

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس حقیقت کی صراحت کی ہے کہ اسلام میں حقیقی اقتدار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ ہے۔ اس کا حکم حکم ہے اور اس کا قانون قانون ہے۔"[۲۴] وہ اس امر کی صراحت بھی کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ مانا جائے وہ طاغوت ہے۔"[۲۵]

مولانا فراہی نے علم ملکوت الٰہی کو تمام علوم کی بنیاد و اساس قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس علم کا تعلق اللہ کی صفات و خصوصیات سے براہِ راست ہے۔ اس نظریہ کی صحیح معرفت پر نبوت اور آخرت کے عقائد کی معرفت کا انحصار ہے کیونکہ خدا کی حاکمیت عدل اور رحمت پر مبنی ہے اور آخرت کا سارا حساب کتاب اس کی حاکمیت اور عدل پر منحصر ہے۔[۲۶]

مولانا فراہی کے نزدیک حاکمیت اعلیٰ کا صحیح فہم اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا کی تاریخ، دین و مذہب کی تاریخ، شریعتوں کے اصول اور ان کی حکمتیں، انجیل اور بشارت احمدیہ کا فہم، سیاست الٰہیہ، مثالی سیاست، شریعت خداوندی کی تطبیق، بندوں کے ساتھ اللہ کے مختلف معاملات وغیرہ یہ سارے بنیادی امور حاکمیت کے صحیح علم ہی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔[۲۷]

مولانا آزاد نے سیاسی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ پر مزید شرح وبسط سے کام لیتے ہوئے نہایت بے خوفی سے گفتگو کی ہے اور خدا کی اطاعت سے منہ موڑ کر قانون سازی اور قوانین انسانی کی پیروی کو سیاسی شرک سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے امرا و حکام کی اطاعت کو اطاعتِ الٰہی کے منافی اور توحید الٰہ کے قرآنی تصور سے متصادم قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"قریش مکہ نے اپنے بڑوں کی مورتیاں بنا رکھی تھیں تم نے دنیوی تاج و تخت اور احکام و امرا کو ان کی جگہ دے دی ہے۔ تم ان سے اس طرح ڈرتے اور ان کے نام سے کانپتے ہو جو صرف خدا ہی کے ساتھ سزاوار تھا۔ تم ان کا ذکر اس احترام و عظمت سے کرتے ہو جو صرف خدا ہی کا حق خالص تھا۔ تم ان کے آگے اس عاجزی اور ذلت سے جھکتے ہو جو صرف خدا ہی کے سامنے زیب دیتی تھی تم ان کے احکام جائرہ اور اوامر مستبدہ کی اس طرح بلا چون وچرا تعمیل کرتے ہو جس کا حق خدا کے سوا کسی ہستی کو نہ تھا۔ تم خدا کے گھر کے اندر ان کا ذکر کرتے اور ان کی تعریف و تہنیت میں گیت گاتے ہو اور ان کے حکموں اور فرمانوں کا منبروں پر چڑھ چڑھ کر اعلان کرتے ہو پھر اگر یہ شرک فی الصفات نہیں ہے تو کیا ہے؟ کیا شرک و بت پرستی بغیر پتھر کی مورت اور بغیر قربانی کے بھیڑے کے ممکن نہیں؟ کیا شرک و بت پرستی کا گھر دل اور ارادہ نہیں بلکہ مندر کا کلس اور پوجا کا چبوترہ ہے۔"[۲۸]

مولانا مودودی نے ان منتشر افکار و خیالات کی نظریہ کاری کر کے حاکمیت الٰہ کا ایک جامع تصور پیش کیا۔ مولانا کے افکار کی تلخیص چند نکات میں اس طرح بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے لہٰذا فطرتاً امر کا حق (Right to Rule) صرف اسی کو پہونچتا ہے۔

۲۔ قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا ہے کیونکہ وہ مخلوق اور رعیت ہے۔

۳۔ اس سرزمین پر صحیح حکومت و عدالت صرف وہ ہے جو خلافت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہو۔

۴۔ ہر وہ حکومت اور عدالت باغیانہ ہے جو قانون الٰہی کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو خواہ ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیت باہم کتنی ہی مختلف ہو۔

مولانا کے مطابق یہی وہ مرکزی عقیدہ ہے جس پر اسلام کے نظام فکر، نظام اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے اور مسلمان اپنے ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے جب تک وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم نہ کریں۔[۲۹]

طرزِ حکومت

اسلامی نظامِ حکومت کی نوعیت اور طرز پر علماء اور دانش وروں میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (متوفی ۲ راگست ۱۹۶۲ء) نے اسلامی نظام حکومت کو اشتراکیت کے فلسفۂ لادینیت سے متصادم قرار دیتے ہوئے اس کے اقتصادی پہلوؤں سے یک گونہ مشابہ قرار دیا۔ انھوں نے صراحت کی کہ "جب ہم اس فلسفہ (کمیونزم) کے فقط اقتصادی پہلو سے بحث کرتے ہیں اور دنیا کے دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے معاشی کے مقابلے میں اس کو پیش نظر لاتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس حقیقت ثابتہ کے اظہار میں کوئی باک نہ ہونا چاہیئے کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب نظر آتے ہیں۔"[۳۰]

اخوانی رہنما ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی (۱۹۶۴ - ۱۹۱۵ء) نے تو اشتراکیۃ الاسلام کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔[۳۱] علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۱-۱۹۶۳ء) نے جرمنی کی فاشزم کو اپنے سامنے رکھا اور اسلامی حکومت کو آمرانہ طرزِ حکومت کے مماثل قرار دیا۔[۳۲] پروفیسر آرنلڈ (۱۸۶۴ - ۱۹۳۰ء) نے اپنی کتاب The Caliphate میں دورِ رسالت کی حکومت کو Arbitrary, Autocratic ثابت کرنے کی کوشش کی۔[۳۳] مگر

مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ:

"وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے۔ وہ نہ اوتاری ہے نہ شخصی ہے۔ نہ دستوری ہے نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہیں"[۳۵]

مولانا کو شکایت ہے کہ "سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں۔ اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین کہ حکومت کا کوئی جزو کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے"[۳۵] گویا مولانا کو کسی مخصوص نظام حکومت پر اصرار نہیں ہے نہ وہ طرز حکومت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

مولانا فراہیؒ کو سلطنت حرّۃ (آزاد سلطنت) ہی پر اصرار ہے جس کا مدار شورائیت ہے۔ اس میں اقتدار موروثی نہیں ہوتا نہ سلطان کے تحفظ کے لیے خدم و حشم اور عسکر و لشکر کا اہتمام ہوتا ہے۔ فراہی کے تصور حکومت میں جمہوری و ملّی خدمات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں آزادی و مساوات کا دور دورہ ہوتا ہے اور عوام کی عزت و حمیت پوری طرح محفوظ رہتی ہے مولانا نے مثال میں حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت کو پیش کیا ہے۔ دور ملوکیت کو مولانا فراہی سلطنۃ معبّدۃ سے تعبیر کرتے ہیں جہاں حاکم آزاد اور مطلق العنان ہوتا ہے۔ مولانا شاہی اشرافیہ فوجی حکومت اور ملوکیت کے خلاف ہیں کہ یہاں شورائیت اور آزادی کا فقدان رہتا ہے[۳۶]

مولانا مودودیؒ نے اسلامی طرز حکومت Theo-Democracy یعنی الٰہی جمہوری حکومت کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی

ہے اس میں انتظامیہ اور مقننہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔[۳۷]

مولانا آزاد اسلامی نظام حکومت کو اسلامی جمہوریت قرار دیتے ہیں جس میں:-

۱۔ ہر ذاتی و شخصی تسلط کی نفی کی گئی ہے اور حکومت جمہور کی ملکیت ہے۔

۲۔ نفی حکم ذاتی کا پہلا نتیجہ مساوات عمومی افراد بشر ہے۔

۳۔ رئیس جمہوریت کو خلیفہ کہا گیا ہے اور اجماع سے مقصود قوت اکثریت انتخاب ہے اور

۴۔ تکمیل جمہوریت صحیحہ کے لیے رئیس جمہور کو عام افراد ملک کے مقابلہ میں کوئی امتیاز عطا نہ کیا گیا۔[۳۸]

انتخاب امیر

سید سلیمان ندویؒ کی تحریروں میں اس مسئلہ سے کوئی خاص تعرض نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان کا عام رجحان علماء کے روایتی تصور کی طرف نظر آتا ہے۔ جہاں امیر یا خلیفہ کے فرائض وصفات سے بحث ہوتی ہے اور اس کے طریقۂ تسلط یا طرز حکومت سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں واضح ہے وہ اسی شخص کو جائز حاکم مانتے ہیں جس کے اعمال صالحہ نمایاں ہوں، لوگوں نے بخوشی اس کی اطاعت کی ہو۔ اس سے محبت کی بنا پر اس کی تعظیم کرتے ہوں۔ اس کی رائے پر مکمل اعتماد ہو اور اسے اپنے بیشتر معاملات میں انھوں نے ذمہ دار بنایا ہو۔ یہی مولانا کے نزدیک امیر کا انتخاب ہے وہ فرماتے ہیں:

فطاعتهم لأولی الامر	اولوالامر کی اطاعت انتخاب اور آزادی
لیست إلا بالاختیار والحریة	کے ساتھ مشروط ہے اور کوئی شخص
ولا یکون احد منهم أولی	سربراہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس
الامر الا بما ظهر من صالح	کے صالح اعمال رونما ہوں اور لوگوں
اعماله فأذعن له الناس	نے بخوشی اس کے سامنے سر جھکایا ہو

۳۴۴

طوعًا وعظّموہ حُبًّا واعتمدوا	محبت کے ساتھ اس کی تعظیم کرتے ہوں
علیٰ رأیہ مصلحۃً فجعلوہ	اور اسی کی رائے کو قرین مصلحت سمجھتے ہوں اور
وکیلًا فی اکبر الامور وھو	اکثر معاملات میں اسے اپنا نمائندہ بنا لیا ہو اور
انتخابُ الامیر[۳۹]	یہی امیر کا انتخاب ہے۔

مولانا آزادؒ انتخاب عام کے حق میں ہیں۔ وہ خلفائے راشدین کے طرق انتخاب سے تفصیل سے بحث کرتے ہیں اور قاضی ماوردی اور علامہ تفتازانی وغیرہ کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ اس میں انتخاب خلیفہ کے لیے انتخاب و مشورۂ اہل حل وعقد کے ساتھ تعیین اور نامزدگی کی جو شق رکھی گئی ہے وہ حضرت عمرؓ کے انتخاب کے پیش نظر ہے لیکن غور کیجئے تو حضرت عمرؓ کے لیے تحریک گو حضرت ابوبکرؓ نے کی لیکن اس پر تمام ارباب حل وعقد اور پھر عامۃ المسلمین نے پسندیدگی کا اظہار کیا اس لیے وہ بھی تعیین شخصی نہیں بلکہ بمنزلہ انتخاب عام کے تھا۔[۴۰]

اس مسئلہ میں مولانا مودودیؒ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا۔ کسی خاندان یا طبقے کا اس منصب پر اجارہ نہیں ہے اور انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کیسے معلوم کی جائے تو اس کے لیے اسلام میں کوئی خاص طریق کار مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ جمہور قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔[۴۱]

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی (متوفی ۱۹۷۴ء) کا نقطۂ نظر بھی روایتی ہے۔ وہ ایک طرف ملوکیت اور شخصی حکومت کے مفاسد شمار کراتے ہیں[۴۲] اور دوسری طرف اسلامی نظام حکومت میں خلیفہ یا امیر کی تقرری کے لیے تمام طریقوں کو جائز اور درست قرار دیتے ہیں۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ کتاب وسنت کے مطابق "ملک کا انتظام کرو خواہ بطریق ملوکیت ہو یا بطریق جمہوریت ہو۔ چاہے بادشاہ بنو اور چاہے صدر جمہوریہ بنو جو چاہے بنو بہرحال قانونِ شریعت کا اتباع تم پر لازم ہے۔"[۴۳] گویا طرز حکومت اور

سربراہِ ریاست کی تقرری ۔کے طریقہ سے کوئی بحث مولانا نے نہیں کی کسی بھی نظامِ حکومت کو اختیار کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ شریعت کی تنفیذ پیشِ نظر ہو۔ اسلامی احکام کے اتباع و نفاذ کے لیے کسی بھی طرزِ حکومت کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کے فکرِ سیاسی اور نظامِ سیاسی کے ارتقاء پر موجودہ ہندوستان میں خوشیں ہوئی ہیں اور علماء اور دانش وروں نے اس میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی مفکرین کے ان افکار و مباحث کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جائے۔

حواشی و تعلیقات

۱؎ شاہ معین الدین احمد ندوی، حیاتِ سلیمان، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء ص ۱۷۸

۲؎ تفصیل کے لیے دیکھئے سید یوسف کمال بخاری کا مضمون، تحریکِ خلافت، مطالعہ سلیمانی (مقالاتِ بزمِ سلیمان بھوپال) مرتبہ مسعود الرحمٰن خاں ندوی، بھوپال ۱۹۸۶ء ص ۴۱۵، ۴۲۶

۳؎ حیاتِ سلیمان، حوالہ بالا، ص ۲۱۰

۴؎ مولانا نے متحدہ جمہوریت اور آئینی آزادی کی جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں ان سے ان کا مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان اصطلاحات کے مضمرات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پروفیسر ابوالفضل عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی کے سیاسی رجحانات، سید سلیمان ندوی (مرتبہ) پروفیسر عتیق احمد صدیقی، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۵ء ص ۱۴۲-۱۴۳۔ جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی عدم شرکت پر مولانا کے تبصروں اور خیالات پر اسلامی تنقید کے لیے دیکھئے، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تحریکِ آزادیِ ہند اور مسلمان، حصہ اول، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۱۶۷-۱۷۲

۵؎ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء ص ۲۱۹

۶؎ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، جلد ہفتم، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء ص ۱۸

۷؎ نفس مصدر، ص ۲۳

۸؎ نفس مصدر، ص ۱۴۱-۱۴۲

۹؎ نفس مصدر، ص ۱۴۲-۱۴۳

۱۰؎ مولانا ابوالکلام آزاد، ہفتہ وار الہلال، کلکتہ، جلد اول، شمارہ ۱۴، ۴ر اگست ۱۹۱۲ء ص ۱۰-۱۱
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے الہلال کی پالیسی پر اعتراض کیا کہ اس کے دائرہ میں مذہب و سیاست کے سبھی مباحث آگئے ہیں تو مولانا آزاد نے انھیں جواب میں لکھا کہ "بے شک وہ تعلیم اور پالیٹکس جس پر اب تک مصلحین ملت عامل رہے ہیں مذہب کے ساتھ ایک دائرے میں نہیں آسکتے کیونکہ غلامی اور توحید، حق اور باطل، کفر اور اسلام کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے لیکن شاید مولانا کی نظر اس پر نہ گئی کہ الہلال جس تعلیم اور پالیٹکس کی طرف بلاتا ہے وہ تو یکسر قرآن ہی سے ماخوذ ہے اور جب دعوت قرآنی اس کا مقصد ہے تو لازمی طور پر وہ بھی اس کے دائرہ بحث میں ہے اور جب تک اسلام دنیا میں باقی ہے ہمیشہ رہے گا۔" (الہلال، جلد اول، شمارہ ۱۵ر اکتوبر ۲۳ر ۱۹۱۲ء ص)

۱۱؎ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی، مرتبہ خورشید احمد، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۱-۴۲۔

۱۲؎ عبدالحمید الفراہی، فی ملکوت اللہ، دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ، ۱۳۹۱ھ ص ۳۰-۳۱ (افادات)

۱۳؎ نفس مصدر، ص ۲۳-۲۵

۱۴؎ نفس مصدر، ص ۲۵۔

۱۵؎ سید سلیمان ندوی، مقالات سلیمان، جلد سوم، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء ص ۳۷۷
(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔)

۱۶؎ نفس مصدر، ص ۳۹۳

۱۷؎ نفس مصدر، ص ۳۹۸

۱۸؎ دیکھئے سیرۃ النبی جلد ہفتم، ص ۱۴۶-۱۴۸

۱۹؎ مولانا ابوالکلام آزاد، مسئلہ خلافت، مکتبہ احباب لاہور، ص ۵، ۶

۲۰؎ نفس مصدر، ص ۷-۱۱

۲۱؎ تفصیل کے لیے دیکھئے ترجمان القرآن، لاہور، ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ/ فروری ۱۹۳۵ء اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص ۱۹۵-۲۰۰

۲۲؎ اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص ۲۰۳۔

۲۳؎ نفس مصدر، ص ۳۷۱

۲۴؎ مقالات سلیمان، حوالہ بالا، ص ۳۸۱۔

۲۵؎ نفس مصدر، ص ۳۷۶
۲۶؎ فی ملکوت اللہ، حوالہ بالا، ص ۴
۲۷؎ مولانا فراہی کے تصور حاکمیت کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے دیکھئے راقم کا مضمون، اسلام کا نظریہ حاکمیت وخلافت اور مولانا فراہیؒ، علامہ حمید الدین فراہی۔ حیات وافکار، دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء ص ۴۷۳ - ۵۱۰۔
۲۸؎ مولانا ابوالکلام آزاد، مقالات الہلال، ادبستان لاہور، ۱۹۵۵ء ص ۳۸۔
۲۹؎ مولانا مودودی، اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص ۴۹ - ۵۷۔
۳۰؎ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۱ء ص ۳۸۶
۳۱؎ مصطفیٰ السباعی، اشتراکیۃ الاسلام، موسسۃ المطبوعات العربیۃ دمشق، ۱۹۶۰ء صفحات ۴۲۳، اس کتاب میں فاضل مصنف نے "اسلامی سوشلزم" کے خدوخال کی وضاحت کی جو مغرب کے مادی تصور سوشلزم سے یکسر مختلف ہے۔ مصنف کے خیال میں اسلامی سوشلزم فطرت انسانی سے ہم آہنگ اور زندگی، آزادی، علم، وقار اور ملکیت کے پانچ فطری حقوق کا داعی اور محافظ ہے۔ اللہ اس کائنات کا حقیقی مالک ہے اور انسان کو ایماندارانہ تصرف پر اس نے مامور کیا ہے۔ حکومت اساسی عوامی اداروں کی تعمیم (قومیانا) اور تکافل اجتماعی کی بنیاد پر اسلامی قوانین کی تنفیذ کے ذریعہ تنظیم کا کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر السباعی کے اس تصور نے سرمایہ داری کی مخالفت کی وجہ سے، سوشلزم کو اسلام سے مربوط کرنے کی بنا پر اور مصر جمال عبدالناصر کے اشتراکی نظریات سے قدرے مشابہت کے سبب، جبکہ مصر میں اخوان دار وگیر کے سخت امتحان سے گزر رہے تھے، بڑا اشتعال پیدا کیا اور اسلامی حلقوں میں بالعموم اس کی پذیرائی نہ ہوئی۔
۳۲؎ تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کی کتاب، تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے تناظر میں، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۸۴ء ص ۱۸۹ - ۱۹۵۔
۳۳؎ Arnold. S.T.W. The Caliphate, Routledge & Paul Ltd. London, 1965, P. 53.
۳۴؎ سیرت النبی، جلد ہفتم، ص ۱۹۰
۳۵؎ نفس مصدر، ص ۱۹۱-۱۹۲
۳۶؎ فی ملکوت اللہ، حوالہ بالا، ص ۳۲

۳۷؎ اسلامی ریاست، حوالہ بالا، ص ۱۳۰

۳۸؎ مقالات الہلال، حوالہ بالا، ص ۱۳۹ - ۱۴۰

۳۹؎ مولانا عبدالحمید الفراہی، فی ملکوت اللہ، حوالہ بالا ص ۲۴-۲۵

۴۰؎ مقالات الہلال، حوالہ بالا، ص ۱۱۵

۴۱؎ اسلامی ریاست، حوالہ بالا ص ۳۳۹ - ۳۴۰

۴۲؎ مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ التفسیر والحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، نظام اسلام مع دستور اسلام، تعلیمی پریس لاہور، ۱۳۸۷ھ، ص ۸۸

۴۳؎ نفس مصدر، ص ۹۶ - ۹۷۔ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی حیات و خدمات کے لیے دیکھئے ماہر القادری، یادرفتگان جلد دوم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۹۲ء ص ۲۱۲ - ۲۱۴، نیز مولانا مفتی محمد شفیع کا مقالہ موت العالِم موت العالَم، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، جلد ۴۸، شمارہ ۳، دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۲۳-۲۹

مصر کے نامور محقق استاذ ابوزید شلبی خلافت راشدہ کے دور اور نظام حکمرانی سے بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خلافت کا طریقۂ انتخاب اور نظام کار جمہوری تھا اس لیے کہ شوریٰ کا مکمل نظام نافذ العمل تھا۔ دوسری طرف خلیفہ شوریٰ کے فیصلوں کا پابند نہ تھا اسے حق استرداد حاصل تھا اس حساب سے اسے مطلق ملوکیت سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے تیسری طرف خلیفہ کتاب وسنت کا پابند تھا اور اس لحاظ سے اُس نظام کو ہم محدود بادشاہت بھی کہہ سکتے ہیں مگر ان تمام صورتوں میں عوام کی رضامندی اور ان کی رائے کو ہر حال میں مقدم رکھا جاتا تھا۔ تاریخ الحضارۃ الاسلامیۃ و الفکر الاسلامی، مکتبہ وہبہ قاہرہ، طبع خامس، ۱۹۸۶ء ص ۷۳ - ۸۸۔

اسلامی معاشرت پر مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک قیمتی اور اہم کتاب
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں
صفحات: ۶۰ قیمت: ۸ روپئے
اس وقیع کتاب کا انگریزی ترجمہ
MUSLIM WOMEN: ROLE AND RESPONSIBILITIES
کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی جاننے والے قارئین کے لیے ایک تحفہ: صفحات: ۶۰ قیمت: ۲۰ روپیے
ملنے کا پتہ: مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

تعارف وتبصرہ

احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذائیں

مصنف: ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی

ناشر: سدرہ پبلشرز، نعمت اللہ بلڈنگ، نعمت اللہ روڈ، امین آباد، لکھنؤ - ۱۸

سنہ اشاعت ۱۹۹۶ء صفحات ۲۴۸ قیمت پیپر بیک ۹۰/- مجلد ۱۲۰/-

مصنفین کی جدت پسند طبیعتیں دینی علوم پر کام کے نئے نئے پہلو نکال لیتی ہیں۔ احادیثِ نبوی پر اب تک بے شمار پہلوؤں سے کام ہوا ہے۔ لیکن زیرِ تبصرہ کتاب دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہ پہلو جس پر کام کرنے کی سعادت فاضل مصنف کو حاصل ہوئی ہے، اب تک تشنۂ تحقیق تھا۔

طبِ نبوی پر خاصا کام ہو چکا ہے۔ محدثین نے اپنی کتابوں میں 'کتاب الطب' کے تحت اس موضوع کی احادیث جمع کر دی ہیں۔ بعد میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں ابونعیم اصفہانیؒ، ابن قیم جوزیؒ، شمس الدین ذہبیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کی کتابوں کو کافی شہرت ملی۔ فارسی، ترکی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی طب نبوی کے نام سے متعدد تصانیف موجود ہیں۔ عصرِ حاضر میں طب نبوی اور جدید سائنس کے درمیان تقابلی مطالعہ کا رجحان ابھرا ہے۔ ان کتابوں میں احادیث میں مذکور ادویہ کی شناخت کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ بات باعثِ افسوس ہے کہ ان میں بہت سی فاش غلطیاں جگہ پا گئی ہیں، مثلاً زیادہ تر کتابوں میں بہی (سفرجل) لوبان (لبان) کندر، عود ہندی، ورس اور کافور وغیرہ کی شناخت ایسے نباتاتی ناموں سے کی گئی ہے جو سراسر غلط ہیں۔ ضرورت تھی کہ علم نباتات کا کوئی ماہر اس کام کو انجام دے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف نے پوری فنی مہارت کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر اقتدار فاروقی نیشنل بوٹینکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں سائنٹسٹ اور اس کے شعبۂ نباتاتی کیمیا کے صدر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ قرآن مجید میں مذکور

نباتات پر اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان کی اس کتاب کو ملک و بیرون ملک کے مختلف حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سے تحریک پاکر انھوں نے یہ دوسری کتاب تصنیف کی ہے جس میں احادیث میں علاج و معالجہ یا دوسرے فوائد کے ضمن میں مذکور نباتات کی سائنسی شناخت کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایسی تقریباً ۷۵ نباتات، دواؤں، غذاؤں، پھلوں اور عطریات کو احادیث سے نکال کر ان کی تحقیق کی ہے۔ پہلے ہر نبات کے مختلف زبانوں میں نام ذکر کیے ہیں۔ پھر اس کا سائنسی نام، فیملی: ماہیت اور پیداواری علاقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس سے متعلق احادیث درج کی ہیں اور حسب ضرورت نوٹ اور تشریحات دی ہیں۔ آخر میں انگریزی میں اس کی طبی خصوصیات، استعمال اور کیمیاوی اجزا سے بحث کی ہے۔ احادیث میں مذکور بہت سی نباتات وہ ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے ان کی شناخت متعین کرکے اور ان سے متعلق احادیث نقل کرکے تفصیل کے لیے اپنی کتاب "نباتاتِ قرآن" سے رجوع ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

ابتدا میں فاضل مؤلف نے "طب نبوی" پر اصولی حیثیت سے بحث کی ہے۔ ان کی یہ بحث بہت قابلِ قدر اور معتدل ہے۔ انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "طب نبوی کے معنی و مفہوم نہ تو طب کی کتاب کے ہیں اور نہ ہی اس سے مراد کسی طبی نسخہ سے ہے لہٰذا اس کا موازنہ موجود طبی علم سے کرنا یا قدیم طبی کتابوں سے اس کا مقابلہ کرنا ایک نامناسب طریقہ کار ہے..... طب نبوی نام ہے اس ہدایت کا جو ہمیں دوا اور دعا کی ضرورت سمجھانے کے لیے دی گئی۔ طب نبوی ایک فہمائش ہے ان حضرات کے لیے جو مرض کو تقدیرِ الٰہی سمجھ کر علاج و دوا کو گناہ سمجھتے ہیں۔ طب نبوی نام ہے اس حکم کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو طب کے میدان میں نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے دیا" (ص ۳۹) ادارۂ تحقیق کے سکریٹری مولانا سید جلال الدین عمری نے اپنی گراں قدر تصنیف "صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات" میں اس سلسلے میں بہت عمدہ بحث کی ہے۔

کتاب کے شروع میں آٹھ دواؤں (اذخر، قسط، مشک، عنبر، جو، حنا، لوبان، کافور) پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اصلاً یہ مقالات تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مقالات میں مصنف کی تحقیقی شان نمایاں ہے۔ انھوں

نے ان کی ماہیت، ذرائع حصول اور طریقۂ استعمال کے ساتھ ان کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں قرآن وحدیث اور بائبل کے علاوہ مختلف زبانوں کے مراجع سے استفادہ کیا ہے۔

بعض نباتات کی تحقیق میں مصنف کو کامیابی نہیں ملی ہے یا دستیاب معلومات پر انھیں اطمینان نہیں ہوسکا ہے۔ مثلاً عنم (ص۲۱۶) سعدان (ص۲۲۵) عرفط (ص۲۲۹) اور جرجیر (ص۲۳۱) اس کا انھوں نے برملا اعتراف کرتے ہوئے مزید تحقیق کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔

تبصرہ نگار کا احساس ہے کہ مصنف نے احادیث کے انتخاب میں دقتِ نظر اور احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ اولاً انھوں نے بہت سی حدیثیں بغیر حوالے کے نقل کی ہیں۔ ثانیاً جن حدیثوں کے حوالے دیے ہیں وہ بھی نامکمل ہیں کہیں صرف راوی کا نام دیا ہے تو کہیں صرف کتاب کا۔ صحابی کے قول حتی کہ محدث کی تشریح کو بھی انھوں نے حدیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ (مثلاً ص۹۹ ص۱۲۱ ص۲۳۲ ص۱۵۸ ص۱۶۲ ص۱۷۰) اسی طرح بہت سی موضوع احادیث بھی شاملِ کتاب ہیں۔ نرگس (نرجس) اور مسور (عدس) سے متعلق احادیث کے موضوع اور اجمود (کرفس) اور بینگن (بادنجان) سے متعلق احادیث کے ضعیف ہونے کی صراحت خود مصنف نے ابن قیم کے حوالے سے کردی ہے۔ حالانکہ ابن قیم نے موخرالذکر دونوں نباتات سے متعلق احادیث کو بھی (ضعیف نہیں بلکہ) موضوع اور باطل قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ کاسنی (ہندبا) مرزنجوش (بہی، سفرجل) انار (رمان) انجیر (تین) اور چاول (ارز) سے متعلق مصنف نے جو احادیث نقل کی ہیں، انھیں بھی ابن قیم اور دوسرے محدثین نے موضوع اور سراسر باطل قرار دیا ہے۔ بینگن سے متعلق موضوع حدیث پر ابن قیم نے لکھا ہے: "یہ بات کسی معمولی عقل والے شخص کی جانب منسوب کرنا بھی معیوب ہے چہ جائے کہ اس کی نسبت انبیاء کی طرف کی جائے (زاد المعاد، موسسۃ الرسالہ ۱۹۸۵ء ۴/ ۱۹۱)

مصنف کی اس سہل انگاری نے کتاب کی استنادی حیثیت کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوشش بس یہ رہی ہے کہ کتب احادیث میں جتنی بھی نباتات کے نام مذکور ہیں، سب کی سائنسی شناخت کردیں خواہ ان کے زبانِ نبوی سے ادا ہونے کا ثبوت موجود ہو یا نہ ہو۔

بعض احادیث کے ترجمے نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ ص۱۱۷ پر ترمذی کے حوالے سے حضرت ام سلمہؓ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں نہ تو ایسا کوئی زخم ہوا اور نہ ہی کانٹا چبھا جس پر مہندی لگائی گئی ہو" یہ حدیث ام سلمہؓ سے نہیں بلکہ سلمیٰ نامی آں حضرت کی ایک خادمہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں ما کان یکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرحۃ ولا نکبۃ الا امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضع علیہا الحناء (ترمذی ابواب الطب باب ماجاء فی التداوی بالحناء) اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی زخم لگتا یا کانٹا چبھتا تو آپؐ مجھے اس پر مہندی لگانے کا حکم دیتے تھے۔"

ایک حدیث حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا: ان اللہ لم ینزل داءً الا انزل لہ شفاءً، علمہ من علمہ وجہلہ من جہلہ (مسند احمد ۱/۳۷۷) اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "خدائے عزوجل نے کوئی بیماری ایسی نہیں بھیجی جس کے لیے شفا نہ رکھی ہو جس نے جاننا چاہا اسے بتایا اور جس نے پرواہ نہ کی اسے ناواقف رکھا۔" (ص۳ ص۲۹) حدیث کے دوسرے جزء کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "بعض لوگوں کو اس کا علم ہوگیا اور بعض اسے نہیں جانتے۔"

فاضل مصنف نے ہر دو/نباتات کے سلسلہ میں جن انگریزی مراجع سے استفادہ کیا ہے ان کا حوالہ تو جدید انداز پر صفحہ کی تعیین کے ساتھ دیا ہے لیکن معلوم نہیں کیوں عربی یا اردو مراجع کا ذکر بغیر متعین حوالے کے کیا ہے۔ کتب احادیث کے حوالوں میں بھی یکسانیت اور صحت کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن قیم کی الطب النبوی کے لیے کہیں ابن قیم لکھا گیا ہے (ص۳۸، ص۱۳۲، ص۱۳۳) اور کہیں الجوزی (ص۲۷، ص۱۰۹، ص۱۱۰، ص۱۲۸ وغیرہ) اسی طرح امام دیلمی کے مجموعۂ حدیث کے لیے کہیں مسند فردوس (ص۱۴۵، ص۱۵۳، ص۱۵۵) لکھا گیا ہے اور کہیں دیلمی (ص۱۲۶، ص۱۷۳، ص۲۱۲) حالانکہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔ صحیح بخاری کی کتاب الطب کا حوالہ الطب النبوی (ص۴۷ ص۹۸) کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

کتاب میں بعض تضادات بھی ملتے ہیں۔ ایک جگہ مصنف نے لکھا ہے: "طب نبوی کی بعض کتابوں میں شیح کو بھی حب رشاد کا نام دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے (ص۲۴) جبکہ دوسری جگہ خود انھوں نے حب رشاد کی وضاحت شیح سے کی ہے۔ لکھا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اپنے گھروں میں حسب ارشاد (حدیث: شیخ) سے دھونی دیتے رہا کرو (ص۲۰۲)
کمپیوٹر کتابت کی غلطیاں بھی کثرت سے ہیں۔ ان کی وجہ سے اشخاص اور کتب کے نام کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ مثلاً عمرو بن شعیب کو عمرو بن شعب (ص۳۵) یحییشوع کو یحییشو (ص۳۳) اسماعیل کو اسمائیل (ص۴۰) اسحاق بن عمران کو اسحاق بن عمان (ص۸۶) بشیر بن الخصاصیہ کی بیوی جہذمہ کو بشیر بن خفاصیہ کی بیوی جہدفہ (ص۷۳) یکتھال کو یکٹھال (ص۸۴) کتاب الاعتصام کو کتاب الامتصام (ص۵۲) غزل الغزلات کو غز الغزلات (ص۸۹) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں آخری الفاظ کو خیر المعاد (ص۲۲) لکھا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ یہ کتاب احادیث میں مذکور نباتات، ادویہ اور غذاؤں کی سائنسی شناخت کے موضوع پر ایک دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ اس اہم علمی خدمت پر فاضل مصنف دینی اور علمی حلقوں کی جانب سے ازحد شکریہ کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ ان کی پہلی تصنیف "نباتات قرآن" کی طرح اس کتاب کو بھی عام مقبولیت حاصل ہوگی اور اس کا اگلا ایڈیشن تصحیح کے اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آئے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

حلال وحرام

مولف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر: دارالاشاعت دارالعلوم سبیل السلام، سبیل نگر حیدرآباد ۵
صفحات: ۴۸۰ قیمت ۱۰۰ روپے

انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں سے متعلق کتب فقہ میں جزئیات وتفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سے روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے ضروری اور اہم احکام ومسائل ماضی قریب میں متعدد اہلِ علم نے "حلال وحرام" کے نام سے، مرتب کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں عالم عرب کی مشہور شخصیت ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تصنیف الحلال والحرام فی الاسلام کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اولاً یہ کتاب مختصر ہے اور بہت سے ضروری مسائل اس میں بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ثانیاً اس میں فقہاء کی آراء سے نسبتاً کم فائدہ اٹھایا گیا ہے اور ثالثاً بعض مسائل میں ایسی رائے پیش کی گئی ہے جو اکثر اہلِ علم کی آراء سے مختلف ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کتاب

مرتب کی جائے جس میں ان چیزوں کا تدارک کر دیا گیا ہو۔ زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دار العلوم دیوبند کے فاضل اور دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد میں صدر مدرس ہیں۔ فقہی مراجع پر آپ کی دست رس اور مسائل پر آپ کی گہری نظر ہے۔ اس سے پہلے آپ کی کتابیں جدید فقہی مسائل، قاموس الفقہ اور طلاق و تفریق علمی حلقوں میں عام مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ یہ کتاب بھی آپ کی فقہی بصیرت پر شاہد ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں حلال و حرام سے متعلق شریعت کے بنیادی اصول و قواعد واضح کیے گئے ہیں۔ بقیہ ابواب میں عقیدہ و ایمان، صفائی ستھرائی، خورد و نوش، طب و علاج، لباس و پوشاک، زیبائش و آرائش، تفریح و آداب، نکاح و طلاق، کسب معاش اور آداب و اخلاق سے متعلق احکام و مسائل پر قرآن و سنت کی روشنی میں اور کتب فقہ کے حوالوں کے ساتھ، روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے اپنے انداز تالیف کا یوں تعارف کرایا ہے: "مسائل و احکام اور آداب کے ساتھ قرآن و حدیث سے اس کا ماخذ بھی نقل کر دیا گیا ہے اور فضائل و رذائل بھی بیان کر دیئے گئے ہیں تاکہ یہ تحریر صرف تحقیق نہ ہو بلکہ دعوت و تذکیر بھی ہو، جہاں ضرورت محسوس ہوئی حکمت و مصلحت بھی واضح کر دی گئی ہے اور ہر باب کے شروع میں اس باب سے متعلق اسلام کی اصولی ہدایات اور شریعت کے عمومی مزاج و مذاق پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ہر باب سے متعلق معمولات نبوی کے نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ بات مستند اور معتبر ماخذ سے لی جائے اور ان کی صراحت کے ساتھ ذکر کی جائے۔ زبان سہل اور عام فہم ہو اور فقہ و قانون کی خشکی کے ساتھ دعوت و نصح کی حلاوت بھی قارئین کے لیے سامان لذت بنے۔" (ص ۲۶)

مولانا محمد رضوان القاسمی نے اپنی تقریظ میں "مسائل کے احاطہ، حوالہ جات کے اہتمام، زبان کی حلاوت اور شائستگی، اسلوب تحریر میں نصح و تذکیر کا غلبہ اور مسائل کے بیان کرنے میں اور قابل بحث امور پر اظہار رائے میں اعتدال و توازن اور افراط و تفریط سے گریز اور کتب فقہ میں پھیلے ہوئے اور منتشر مسائل کے درمیان حسن انتخاب" کو کتاب کی خوبیوں میں شمار کیا ہے (ص ۱۳، ۱۴)

کتاب بہت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ مؤلف نے اپنے ابتدائیہ میں، عجلت

میں اس کتاب کی تیاری کا کئی بار تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس عجلت کے اثرات کہیں نظر نہیں آتے۔ البتہ کہیں کہیں احادیث کے حوالے ناقص ہیں۔ بہتر تھا کہ ان کے مکمل حوالے دیے جاتے جیسا کہ زیادہ تر جگہوں پر اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔
(محمد رضی الاسلام ندوی)

ماہنامہ افکار ملّی نئی دہلی فروری، مارچ ۱۹۹۷ء

خصوصی شمارہ: "ہندوستانی مسلم معاشرہ: ماہیت، مسائل، امکانات"

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس

صفحات ۲۴۰ قیمت ۳۵/- پتا: ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ہندوستان میں مسلم معاشرہ گوناں گوں مسائل سے دوچار ہے جن میں قیادت و سیادت سے لے کر پاکیزگی اور طہارت تک کے مسائل شامل ہیں۔ ان کو سمجھنا اور ان کا حل تلاش کرنا نہ صرف قوم و ملت کی عظیم خدمت ہے بلکہ دین کا ایک اہم فریضہ بھی ہے۔ اسی فریضے کو ماہنامہ افکار ملّی نے اس خصوصی شمارہ کی اشاعت سے انجام دیا ہے۔

یہ خصوصی شمارہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں اصولی مباحث ہیں۔ باب دوم میں مسلم معاشرہ کی ماہیت پر بحث کی گئی ہے اور باب سوم میں مسائل اور امکانات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس شمارہ میں ساٹھ سے زیادہ مقالات شامل ہیں جنھیں ملک کے مشہور علماء اور دانشوروں نے سپرد قلم کیا ہے۔

مسلمانوں کے بعض مسائل قدیم ہیں جیسے ملی قیادت، مسلم پرسنل لاء، نکاح و طلاق عورتوں کے حقوق اور رسوم و رواج کی پیروی وغیرہ۔ ان کی طرف علماء اور دانشوروں نے شروع سے توجہ مبذول کی ہے اور ان پر فکری اور قلمی کاوشیں پیش کی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں کچھ نئے مسائل نے سر ابھارا ہے جیسے شہروں میں رہائش، کچی بستیاں بوڑھوں، معذوروں اور بیواؤں کے مسائل، تاخیر سے شادی، مشترک خاندانی نظام، خاندان کا انتشار، گداگری، اسراف اور فضول خرچی، علماء کے اختلافات اور جدید تفریحات وغیرہ ان مسائل کی طرف علماء کی توجہ اب تک کم رہی تھی۔ لیکن اس خصوصی

شمارہ میں ان مسائل پر مقالات کی شمولیت سے یہ کمی کسی حد تک دور ہوگئی ہے اور ان کے سلسلے میں اسلامی فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید جلال الدین عمری، مولانا وحید الدین خاں، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، ڈاکٹر اجمل فاروقی، جناب وارث ریاضی، مولانا عتیق احمد قاسمی، جناب شفیع مشہدی، پروفیسر عمر حیات خاں غوری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبدالحق فلاحی، مولانا عبدالعزیز سلفی، جناب عبداللہ دانش، جناب محمد زین العابدین منصوری، جناب عطا عابدی اور مولانا انظر شاہ کشمیری کے مقالات خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہیں۔

باب اول میں اصولی مباحث کے تحت جو مقالات ہیں وہ بھی اہم ہیں لیکن بعض پہلوؤں سے ان میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر باب کا آغاز "اسلام میں خاندان کی اہمیت" سے کیا گیا ہے حالانکہ خاندان یا معاشرہ میں سب سے پہلے فرد کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ کی بنیادیں اور حقوق و فرائض پر مشتمل بعض مقالات کی موجودگی اس کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہوتی۔

مسائل کے ذیل میں علماء کے معاشی مسائل، عربی مدارس میں عوامی چندے کے روایتی انداز اور اس سے مسلم ملت پر مرتب ہونے والی خرابیوں پر مشتمل مقالات شامل ہونے چاہئے تھے۔ ایک ہی مسئلہ پر متعدد مقالات زائد معلوم ہوتے ہیں بعض مقالات میں قرآنی آیات اور احادیث کے مکمل حوالے نہیں ہیں اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مجموعی طور پر یہ خصوصی شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔

(محمد جرجیس کریمی)

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم کتاب

ایمان وعمل کا قرآنی تصوّر

الطاف احمد اعظمی

○ ایمان وعمل کے مروجہ تصور کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ○ قرآن وسنت کے نقطۂ نظر کی مدلل اور دلنشیں تشریح کرتی ہے ○ ایمان وعمل کے تقاضے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ واضح کرتی ہے۔
افسٹ کی طباعت۔ خوبصورت سرورق۔ صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپے لائبریری ایڈیشن ۳۵ روپے
ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

خبرنامہ
ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

(۱) شعبۂ تعلیم جماعت اسلامی ہند کی جانب سے دوسرا کل ہند تعلیمی وتربیتی کیمپ ۲۱ تا ۳۰ مئی ۹۷ء نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ ملک کی ۱۴ ریاستوں سے ۸۰ اساتذہ نے اس میں شرکت کی۔ اسلامی مفکروں، دانش وروں اور ممتاز ماہرین تعلیم نے تقریباً ۵۰ تعلیمی و تربیتی موضوعات پر لیکچر دیے۔ سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری نے بھی مختلف مواقع پر خطاب کیا۔

(۲) جماعت اسلامی ہند حلقۂ بہار کی جانب سے ۲۴۔۳۰ مئی ۹۷ء ہفتۂ حقوق نسواں منایا گیا۔ اس کے بعض پروگراموں میں مولانا عمری نے شرکت کی۔ اس کا افتتاحی اجلاس ۲۴ مئی کی شام مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی کے میدان میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اس سے خطاب کیا۔ آپ نے اسلام میں خاندانی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی تعمیر میں عورت کے رول کی وضاحت کی، اس کی ذمہ داریوں اور حقوق کی تفصیلات پیش کیں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی خواتین کو عملاً وہ حقوق دیں جو اسلام نے انھیں دیے ہیں۔ بعد میں مولانا نے ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا اور عورتوں کی تعلیم، حق عمل، معاشی استحکام، مرد وزن کے اختلاط، تعدد ازدواج، طلاق اور دیگر معاشرتی مسائل سے متعلق پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیے۔ ۲۵ مئی کو مولانا نے معززین شہر سے بھی خطاب کیا۔

(۳) مئی کے اواخر میں ایک پروگرام کے تحت مولانا عمری نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس موقع پر دینی تعلیم کے مشہور ادارے دارالعلوم سبیل السلام کے ذمہ داروں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور مدرسہ کا معائنہ کیا۔

(۴) گذشتہ دنوں مولانا عمری کے بعض کتابچے اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز دہلی سے "ہندوستان میں اسلام کی دعوت

اہمیت اور تقاضے" کی اشاعت ہوئی ہے۔ ملیالم میں اس کا ترجمہ بھی منظر عام پر آگیا ہے۔ مولانا کا ایک کتابچہ بہت پہلے "اسلام اور وحدت بنی آدم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ نظر ثانی اور اضافہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ وقت کے ایک اہم موضوع سے بحث کرتا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ اسلامی ساہتیہ پرکاشن نئی دہلی سے اور انگریزی ترجمہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی سے شائع ہوا ہے۔ مولانا کی ایک اہم تصنیف "انسان اور اس کے مسائل" ہے۔ اس میں عقلی اور سائنٹفک اسلوب میں انسان کی بنیادی ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ مدراس سے شائع ہوگیا ہے۔

(۵) ۲۸ جون ۹۷ء کو پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے "اردو تفاسیر پر تصوف کے اثرات" کے موضوع پر ادارۂ تحقیق میں ایک توسیعی خطبہ دیا۔ موصوف نے اردو تفاسیر میں خاص طور پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی کا مطالعہ پیش کیا، ان میں متصوفانہ عناصر کی نشان دہی کی اور ان کو قرآن وسنت کی میزان پر پرکھا۔ بعد میں سامعین نے لیکچر پر کچھ سوالات کیے جن کے موصوف نے جوابات دیے۔ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر اہل علم نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

(۶) گذشتہ سال مولانا سلطان احمد اصلاحی کی ایک کتاب "ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل" جیسے اہم موضوع پر شائع ہوئی تھی۔ اس سال اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اس کتاب کو ایوارڈ سے نوازا ہے۔ مولانا اصلاحی کا ایک کتابچہ "ابتدائے تاریخ کا تصور اور قرآن" کے عنوان سے اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

(۷) ۲۴، ۲۵ مئی ۹۷ء میں المعہد الاسلامی السلفی رچھا، بریلی کے زیر اہتمام مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے تعاون سے "اسلام اور تصوف" کے موضوع پر دو روزہ سمینار مذکورہ مدرسہ کے کیمپس میں منعقد ہوا۔ ادارۂ تحقیق کے رفقاء مولانا سلطان احمد اصلاحی اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی۔ مولانا اصلاحی نے "مسلم معاشرہ پر تصوف کے اثرات" اور ڈاکٹر ندوی نے "تفسیر اشاری۔ ایک مطالعہ" کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔

(۸) مولانا محمد اسلام عمری نے ادارۂ تحقیق میں تصنیفی تربیت کے دوران "اسوۂ صحابہ"

کے موضوع پر کام کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور حسب ضرورت اضافے کیے۔ اب ان کی یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔

(۹) مولانا محمد جعیس کریمی ادارہ میں ایک منصوبہ کے تحت "اسلام میں جرم و سزا کا تصور" کے موضوع پر کام کر رہے تھے۔ اس کی کچھ قسطیں بعض رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ الحمدللہ ان کا یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ (ادارہ)

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی نئی پیشکش

عہد نبوی کا نظام حکومت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرت نبوی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ لیکن اس کتاب میں اس لحاظ سے جدت اور ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جن سے کتب سیرت میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ ابتدا میں عہد رسالت میں ریاست کے تدریجی ارتقا پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے پھر اس کے دور مبارک میں شہری نظم ونسق اور فوجی، مالی اور مذہبی نظاموں سے مفصل بحث ہے۔ اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی پر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا خاص موضوع ہے۔ ان کا نام اعلیٰ تحقیقی معیار کی ضمانت ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری سکریٹری ادارہ اور نائب امیر جماعت اسلامی ہند کا مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۰/- زیادہ منگوانے پر خصوصی رعایت

مکتبہ تحقیق، وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ